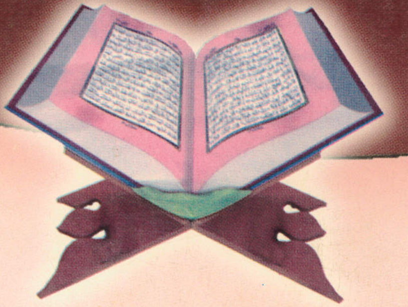
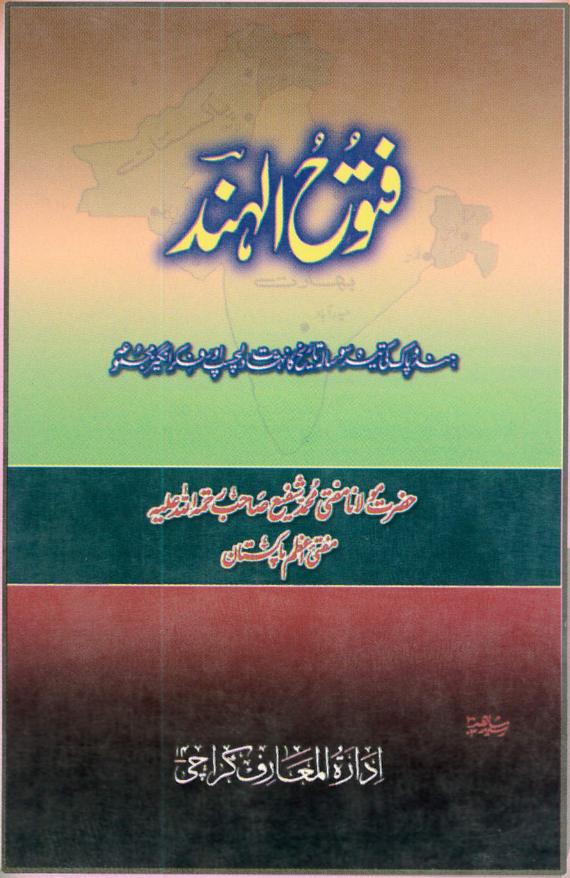


دستورِ قرآنی

جس میں دستورِ مملکت کی اہم دفعات
صرف آیاتِ قرآنی سے ثابت کی گئی ہیں

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان

ادارۃ المعارف کراچی



(331) (69)

اِنِ الحُکمُ اِلَّا لِلّٰہِ ط

حکومت صرف اللہ کے لئے ہے (القرآن)

دستورِ قرآنی

جس میں دستورِ مملکت کی اہم دفعات صرف
آیاتِ قرآنی سے ثابت کی گئی ہیں

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتی اعظم پاکستان

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

باہتمام : محمد مشتاق ستی
طبع جدید : رجب ۱۴۲۴ھ ۔ ستمبر ۲۰۰۳ء
مطبع : احمد پرنٹنگ پریس ناظم آباد کراچی
ناشر : ادارۃ المعارف کراچی۔ احاطہ دارالعلوم کراچی ۱۴
فون : 5049733 - 5032020
ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

- ادارۃ المعارف کراچی احاطہ دارالعلوم کراچی ۱۴
فون: 5049733 - 5032020
- مکتبہ معارف القرآن کراچی احاطہ دارالعلوم کراچی ۱۴
فون: 5031565 - 5031566

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

زیرِ نظر اوراق کوئی مدوّن دستور نہیں، بلکہ درسِ قرآن کی ایک تقریر ہے جو افادۂ اہلِ علم کے لیے ضبطِ تحریر میں لائی گئی، مسجد باب الاسلام متصل آرام باغ کراچی میں روزانہ بعد نماز فجر مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت فیوضہم رکن مجلس تعلیمات اسلام دستوریہ پاکستان وصدر مجلس منتظمہ دارالعلوم کراچی درسِ قرآن دیتے ہیں، چند آیات وہ آئیں جن میں اسلامی دستورِ مملکت کی اہم دفعات مجتمعاً مذکور ہیں۔ حاضرینِ درس کا تقاضا ہوا کہ ان آیات کے ساتھ دوسری آیات بھی جن میں دستوری مسائل مذکور ہیں شامل کر دی جائیں اور اس تقریر کو شائع کیا جائے، تاکہ پاکستانی مسلمانوں پر یہ واضح ہو جائے کہ اسلامی دستور جس کا مطالبہ تمام پاکستان کے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہے وہ صرف ماہرین شریعت علماء وفقہاء کے اجتہادات وقیاسات نہیں، بلکہ اس کی اہم دفعات براہِ راست قرآن مجید سے ثابت ہیں، اس لیے احقر نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا، تقریر کو ضبط تحریر میں لانے

کے بعد حضرت والا کے سامنے پیش کر کے آپ کے ملاحظہ اور اصلاح کے بعد شائع کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ارکانِ اسمبلی اور حکومت کے ذمہ داروں کو توفیق بخشیں کہ وہ قرآن کے ان کھلے ہوئے ارشادات کو دستور سازی کی بنیاد قرار دے کر اپنا اسلامی فرض ادا کریں، اور مسلمانوں سے کئے ہوئے مسلسل وعدوں کو پورا کریں، اور اس پر غور کریں کہ کسی ملک کا دستور روز روز نہیں بنتا، پاکستان کا دستور بنے گا اور آئندہ نسلوں تک چلے گا، ہماری ہڈیوں کا نشان بھی باقی نہ ہوگا، مگر اس دستور کی ذمہ داری اور اس کا ثواب یا عذاب ہمیشہ کے لیے ہماری گردنوں پر ہوگا۔ افسوس ہے کہ ہماری دستور ساز اسمبلی کے ارکان ملک کے دستور کو صرف اپنے گردوپیش کے حالات اور ان کے متعلقہ نفع وضرر کے درمیان دائر کر کے دیکھتے ہیں، حالانکہ یہ مناظر ان کے سامنے ہیں کہ دستور پاکستان کی تدوین کے زمانہ ہی میں کتنے ذمہ دار افراد ہیں جو اسی طرح سوچا کرتے تھے اور ابھی دستور بنا بھی نہیں کہ وہ قبروں میں پہونچ چکے یا اقتدار کی کرسیاں ان سے واپس لے لی گئیں۔ **فَاعْتَبِرُوْا يَآ اُولِى الْاَبْصَارِ**

بندہ نور احمد

ناظم دار العلوم کراچی (نانکواڑہ)   ۲۷ ذیقعدہ ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

عنوانات	صفحہ نمبر

☆☆☆☆

تقریر درسِ قرآن

(متعلقہ دستورِ مملکت)

یوم یکشنبہ ۳۰ رشوال ۱۳۷۲ھ، ۱۲ جولائی ۱۹۵۳ء

از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رکن مجلس تعلیماتِ اسلام دستوریہ پاکستان

مفتیٔ اعظم پاکستان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

درسِ قرآن کے سلسلے میں آج سورہ نساء کی ان دو آیتوں کا نمبر ہے جو اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ سے شروع ہوتی ہیں، ان میں حکومت اور عوام کے فرائض کا بیان اور اسلامی دستورِ مملکت کے چند اہم دفعات مذکور ہیں،

اس وقت سلسلہ کے لحاظ سے انہیں دو آیتوں کی تفسیر بیان کرنا تھا، لیکن دستور کا مسئلہ آج کل ہمارے ملک پاکستان میں بلکہ تمام اسلامی ممالک میں وقت کی ایک اہم بحث بنا ہوا ہے، اس لئے بعض شرکاءِ درس کی یہ خواہش ہوئی کہ اور بھی ان آیات کی تفسیر اسی سلسلے میں شامل کردی جائے جن سے دستوری مسائل نکلتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ وقت اتنا نہیں کہ پورے قرآن میں پورا غور کر کے جہاں جہاں دستوری مسائل مذکور ہیں ان سب آیات کو جمع کیا جا سکے، صرف اپنی یادداشت کے مطابق جو آیات دستوری مسائل پر مشتمل ہیں ان کی تفسیر اور ان سے دستوری دفعات کا ثبوت پیش کرتا ہوں، وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ،

میں اس تمام بیان میں اپنی دانست کے موافق دو باتوں کا التزام کروں گا، ایک یہ کہ کسی مضمون کو قرآن کی طرف اس وقت تک منسوب نہ کروں جب تک قرآنی الفاظ کی واضح دلالت اس پر نہ ہو، دوسرے یہ کہ آیات کی تفسیر سلف صالحین کی تفسیر سے اور دوسرے اصولِ تفسیر سے مختلف نہ ہو، ممکن ہے کہ اس التزام میں مجھ سے کسی جگہ لغزش ہو جائے تو حاضرین میں اہلِ علم حضرات بھی موجود ہیں ان سے درخواست ہے کہ مجھے متنبہ فرما دیں۔

دستور اور قانون میں فرق

قبل اس سے کہ آیات متعلقہ دستور کی تفسیر پیش کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''دستور'' اور ''قانون'' میں فرق واضح کر دیا جائے کیونکہ عموماً لوگ اس سے واقف نہیں، بلکہ دونوں کو ایک چیز سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ سے طرح طرح کے اشکالات میں الجھ جاتے ہیں۔

دستور: نام ہے نظامِ حکمرانی اور حکومت کے بنیادی اصولوں کا کہ کسی سلطنت کو کس طرح چلایا جائے، اس کی دفعات اس طرح کی ہوتی ہیں مثلاً اقتدارِ اعلیٰ کس کا ہے، صدرِ مملکت کا عزل و نصب کس کے اختیار میں، اس کا تقرر کن اصول پر کیا جائے، صدر کے اوصاف کیا ہوں، اس کے فرائض کیا ہوں، طرزِ حکومت پارلیمانی ہو یا صدارتی شخصی ہو یا جمہوری، قانون سازی کا اختیار کس کو ہو اور کن اصول و شرائط پر، وغیر ذلک، اور قانون ملک کے شعبہ جاتی نظام اور اس کی تفصیلات سے متعلق ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ دستور، قانون سے بالکل مختلف ایک چیز ہے۔

دوسری ایک بات اور سمجھ لینا ضروری ہے وہ یہ کہ قرآن مجید تمام اقوامِ عالم کے لیے، تمام شعبہائے زندگی کے واسطے ایک مکمل ہدایت نامہ ہے، اسمیں دستورِ مملکت کے اصول بھی ہیں قانون کے تمام انواع و اصناف بھی، اصلاحِ اعمال و اخلاق کے لیے ہدایتیں بھی ہیں، عبادت گزاری کے طریقے بھی، تمدن و معاشرت کے بہترین اصولوں کی تعلیم بھی ہے، خلوت و جلوت کے آداب بھی، عالم ارواح، عالم عناصر کی پیدائش، اجرام فلکیہ اور نجوم ثوابت و سیارات اور اصول طب کے متعلق اہم معلومات بھی ہیں اور تاریخ اقوام و ملل بھی۔

لیکن اس کا حکیمانہ اسلوب انسانی تصانیف سے بہت بلند و بالا ہے، نہ اس کو فن تاریخ کی کتاب یا کوئی قصہ و ناول کہا جا سکتا ہے۔ نہ فنِ طب کا قرابادین، نہ فنِ نجوم یا فلسفہ و ریاضی کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں، نہ کوئی مرتب دستور و قانون، وہ ایک عجیب و غریب نظامِ حیات اور نسخۂ شفاء ہے جس کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائی میں اترتا اور اپنا اثر دکھاتا ہے۔

وہ یاد کرنے اور تلاوت کرنے کے لئے اتنا آسان ہے کہ پانچ برس کا بچہ پورا حفظ کر سکتا ہے، اور اس کے احکام و مواعظ اتنے سادہ پیرایہ میں ہیں کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی ادنیٰ کوشش کر کے سمجھ سکتا ہے، ساتھ ہی اسکے مضمرات اور غوامض اتنے عمیق ہیں کہ چودہ سو سال کی طویل مدت میں لاکھوں علمائے امت نے اپنی پوری عمریں اس کے تہہ معلوم کرنے میں گزار دی مگر نہ پا سکے۔ بلکہ اپنی اپنی فہم و فراست اور غور و تدبر کے موافق ہر شخص نے حصہ پایا اور قیامت تک پاتے رہیں گے، یہی وہ میدان ہے جس میں ماہر کتاب اللہ دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں، یہ کہنا جہالت کے سوا کچھ نہیں کہ ''قرآن صرف ملاؤں کی جاگیر نہیں، ہر مسلمان کا حق اس میں مساوی ہے'' کیوں کہ یہاں جاگیر کا سوال نہ کبھی ہوا نہ ہو سکتا ہے، بلاشبہ حق تو سب کا ہے مگر ایسا ہی جیسے وزارتِ عظمیٰ اور صدارتِ مملکت ایک جمہوری ملک میں ہر باشندۂ ملک کا حق ہے، مگر اس حق کو حاصل وہی کرتا ہے جو اس کے شرائط کو پورا کریں، ایک گدھا گاڑی ہانکنے والا جاہل بغیر کسی تعلیم و صلاحیت حاصل کئے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے وزیر اعظم کیوں نہ بنایا گیا، ایسے ہی وہ لوگ جنہوں نے قرآن کو سمجھنے کے لئے عمر کے پچاس سال میں سے پچاس دن بھی نہ خرچ کئے ہوں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم بھی قرآن کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسے ماہرین قرآن و سنت، جن کی عمریں اسی میدان کی سیاحت میں گزری ہیں۔

قرآن مجید کی ترتیب بھی عام انسانی تصانیف کی ترتیب سے بالکل مختلف ہے۔ ایک قصہ لیا جاتا ہے اس کے ٹکڑے ٹکڑے پورے قرآن میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ مکرر سہ کرر آتے ہیں، بلاشبہ اس کلام ربانی کی سورتوں اور آیتوں میں کوئی گہرا ربط ہے اور اسی وجہ سے وہ دلوں پر قبضہ جماتا ہے۔ اس کو جتنا پڑھئے طبیعت اکتانے کی بجائے ذوق و شوق اور بڑھتا

ہے۔ گو اس ربط و ترتیب کا ہماری فہم احاطہ نہ کرسکے، اس کی مثال چمن بندی سے پیدا شدہ سنیری اور پہاڑی اور بحری مناظر کی سنیریوں سے دی جاسکتی ہے کہ آخر الذکر میں بظاہر کوئی ربط نہیں ہوتا، ایک طرف پہاڑ کی اونچی چٹان کھڑی ہے وہ بھی کسی خاص سانچہ میں ڈھلی ہوئی نہیں اور دوسری طرف گہرا غار ہے لیکن اس کی یہ ظاہری بے ربطی اپنے اندر وہ دل ربا ربط رکھتی ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ چمن بندی اس کو نہیں پاسکتی۔

اس تمہید سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ قرآنِ کریم اس زمانے کے مروّجہ دساتیر کی طرح کوئی دفعات پر مشتمل مرتب دستور کی کتاب نہیں۔ اس میں دستوری مسائل بھی مختلف سورتوں کی مختلف آیتوں میں بکھرے ہوئے ہیں، میں اس وقت دستوری مسائل سے متعلقہ آیات کو بلالحاظ ترتیبِ قرآنی اس طرح بیان کررہا ہوں کہ وہ کسی قدر دستوری ترتیب سے قریب ہوجائے اور یہ ظاہر ہے کہ اس وقت پیشِ نظر کسی مکمل دستور کی تدوین نہیں بلکہ صرف ان دفعات دستور کا بیان ہے جو براہِ راست قرآن مجید سے ثابت ہیں، مکمل دستور اسلامی اور اس کی پوری دفعات مدوّن کرنا ہوں تو ان آیات کے ساتھ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی و عملی تشریحات و تعلیمات کو ساتھ ملا کر بآسانی کیا جاسکتا ہے کیونکہ دین کے تمام مسائل کا ماخذِ اصلی کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ **واللہ الموفق والمعین.**

☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآنی دستورِ مملکت

حکومت کے اغراض و مقاصد

دفعہ (۱)

(الف) تمام باشندگانِ مملکت کو عدل و اعتدال پر قائم کرنا۔

(ب) مملکت سے داخلی اور خارجی فتنہ و فساد کو دفع کرنا۔

(ج) مسلمانوں کے لیے اقامتِ نماز اور ادائے زکوٰۃ کا انتظام۔

(د) لوگوں کو بھلائیوں پر آمادہ کرنے اور برائیوں سے روکنے کا انتظام۔

آیت (۱): لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتَابَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ۔ (۲۵:۵۷)

ترجمہ:۔ ''ہم نے اپنے رسولوں کو معجزات دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل و اعتدال پر قائم ہو جائیں۔''

اس آیت میں انبیاء علیہم السلام جو زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت کے حامل، اور نظم و سیاستِ ملک کے ذمے دار ہیں ان کو دو چیزیں عطا فرمانے کا ذکر ہے، ایک کتاب جو معاش و معاد کے اصولِ صحیحہ کی رہنمائی کرنے والی ہے۔ دوسرے میزان جو ان اصول کو عملی جامہ پہنانے والے ذرائع و وسائل کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مادی ترازو بھی اتاری جس میں اجسام تلتے ہیں۔ اور عملی ترازو بھی جسے عقلِ سلیم کہتے ہیں اور اخلاقی ترازو بھی جسے صفتِ عدل و

انصاف کہا جاتا ہے۔ اور سب سے بڑی ترازو دین حق ہے جو خالق ومخلوق کے حقوق کا ٹھیک ٹھیک تصفیہ کرتا ہے اور جس میں بات پوری تلتی ہے نہ کم نہ زیادہ (حواشی شیخ الاسلام) اور پھر دونوں چیزوں کے عطا فرمانے کی حکمت وغرض یہ بتلائی گئی ہے کہ لوگ عدل واعتدال پر قائم ہوجائیں۔

آیت ② : وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ. (۲: ۲۵۱)

ترجمہ: ''داؤد نے جالوت (لشکر کفار کے سردار) کو قتل کردیا اور ہم نے داؤد کو حکومت اور حکمت (نبوت) عطا کردی اور اس کو جو کچھ اللہ نے چاہا سکھادیا اور اگر (اس طرح) سلطنت قائم کرکے اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو دوسروں پر ظلم کرنے سے نہ روکتے تو زمین میں فساد ہوجاتا، مگر اللہ تعالیٰ جہان والوں پر احسان وانعام کرنے والے ہیں۔'' (اس لئے حکومت وسلطنت قائم کردی کہ فساد نہ ہو)۔

روح المعانی میں ہے:

وفی هذا تنبیه علیٰ فضیلة الملک وانه لولاه ما استتب امن العالم ولهذا قیل الدین والملک توأمان. (ص۱۷۴، ج۲)

ترجمہ: ''اس آیت میں ملک وسلطنت کی فضیلت پر تنبیہ ہے کہ اگر دنیا میں نظامِ حکومت وسلطنت قائم ہونے کا دستور نہ ہوتا تو نظامِ عالم درہم برہم ہوجاتا، اسی لئے کہا گیا ہے کہ دین اور حکومت دو جڑواں بچے ہیں۔''

اور چونکہ حکومت وسلطنت کا اہم مقصد فتنہ وفساد کو روکنا ہے، اس لئے عادۃ اللہ یہ جاری ہے کہ حکومت وسلطنت بعض اوقات کفر کے ساتھ تو جمع ہوجاتی ہے لیکن ظلم وفساد کے ساتھ جمع ہوکر نہیں رہ سکتی۔

اسی لئے فرشتوں نے انسان کی خلافت وحکومت کے خلاف جو وجہ بارگاہِ حق تعالیٰ میں پیش کی وہ یہ نہ تھی کہ انسان کفر وبت پرستی کرے گا بلکہ یہ کہا گیا کہ وہ فساد وخونریزی کرے گا،

کیونکہ کفر وشرک اپنی ذات میں اگرچہ فساد وخونریزی سے بڑا جرم ہے لیکن نظمِ مملکت کے لحاظ سے فساد وخونریزی اشد ہے۔

آیت ③ :- اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲: ۴۱)

ترجمہ: ''یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ اور نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں''

اس آیت میں واضح طور پر دنیا کی سلطنت دینے کی غرض مذکورہ چار کام بتلائے ہیں، نماز کی اقامت، زکوٰۃ کا انتظام، اچھے کاموں کا حکم، بڑے کاموں سے روکنا۔

طرزِ حکومت

دفعہ (۲)

حاکمِ حقیقی صرف اللہ رب العالمین ہے، زمین کی حکومت بنی آدم کو بطور امانت ونیابت سپرد کی جاتی ہے

قرآن کریم کی آیاتِ ذیل اس پر شاہد ہیں:۔

آیت ④ : لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ، (۵: ۱۲۰)

ترجمہ: ''اسی کا ہے ملک آسمانوں کا اور زمین کا اور تمام چیزوں کا جو آسمان اور زمین میں ہیں، اور وہی ہے ہر چیز پر قادر''

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ. (۶: ۵۷)

ترجمہ:۔ ''حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ کے''

آیت ⑤ :۔ فَسُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۔

(۸۳:۳۶)

ترجمہ: ''پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ملک کی ہر چیز ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے''

آیت ⑥ :۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ۔

(۲۶:۳)

ترجمہ :۔ ''آپ یہ کہئے کہ اے اللہ! ملک وسلطنت کے مالک تو جس کو چاہتا ہے مملکت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔''

آیت ⑦ :۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۔ (۳۰:۲)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے وقت فرمایا): ''میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔''

ان مضامین کی آیات قرآن کریم میں بے شمار ہیں، صرف چند پر اکتفاء کیا گیا،

دفعہ (۳)

اسلامی مملکت میں کتاب وسنت کے خلاف کوئی قانون نہ پاس ہوسکتا ہے نہ باقی رکھا جاسکتا ہے نہ کتاب وسنت کے خلاف کوئی انتظامی حکم دیا جاسکتا ہے۔

سورۂ مائدہ پارہ ۶ میں تین آیات قریب قریب ہیں

آیت ⑧ :وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ

(۴۴:۵)

ترجمہ :۔ ''اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا سو وہی لوگ کافر ہیں۔''

آیت ⑨ : وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ

(۴۵:۵)

ترجمہ: ''اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا، سو وہی لوگ ظالم ہیں''

آیت ⑩ : وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ

(۴۷:۵)

ترجمہ: ''اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ نازل کیا اللہ نے سو وہی لوگ ہیں نافرمان''

معنی یہ ہیں کہ اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام سے جو شخص اعتقادی طور پر مخالفت کرے کہ ان کو حق وصحیح نہ مانے وہ کافر ہے اور جو اعتقادی طور پر حق ماننے کے باوجود عملاً فیصلہ اس کے خلاف دیں وہ ظالم اور نافرمان ہیں۔

ان تینوں آیتوں میں عنوانِ بیان یہ اختیار کیا گیا ہے کہ جو شخص خدا کے نازل کردہ احکام کے خلاف حکم کرے وہ کافر فاسق ظالم ہے، مثبت طور پر یہ نہیں فرمایا کہ ایسا قانون جو اللہ نے نازل نہیں کیا اس کے موافق فیصلہ کرنے والے کافر فاسق ہیں، اس میں حکمت یہ ہے کہ جن امور میں اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ یا بواسطۂ رسول کوئی حکم نہیں فرمایا ان سے ایسے معاملات میں انسانی قانون سازی کی گنجائش دیدی، یعنی جس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قانون نازل فرمادیا اس کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جاسکتا، لیکن جس معاملات میں اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ یا بالواسطہ رسول کوئی قانون نازل ہی نہیں فرمایا وہاں انسان کو اختیار ہے کہ اپنے ملک، زمانہ اور ماحول کے مقتضیات پر نظر کر کے باہمی مشورہ سے جیسا چاہیں قانون بنالیں، اس خاص عنوان کے ذریعہ جمہور کو دائرۂ مباحات کا ایک وسیع میدان دیدیا گیا، جس میں وہ اپنی مرضی کے موافق قانون سازی کرسکتے ہیں،

نیز سورۂ حشر کی آیت **وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا**

(۷:۵۹)

(ترجمہ) ''جو دے تم کو رسول سو لے لو اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو۔'' اس سے معلوم ہوا کہ بواسطۂ رسول جو احکام بھیجے جائیں وہ بھی ما انزل اللہ کے حکم میں ہیں، اس لئے کتاب یا سنتِ رسول کے خلاف قانون سازی ممنوع ہے۔

آیت (۱۱): اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵۰:۵)

ترجمہ: ''اب کیا حکم چاہتے ہیں کفر کے وقت کا، اور اللہ سے بہتر کون ہے حکم کرنے والا یقین کرنے والوں کے واسطے۔''

قرآنِ کریم میں اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات ہیں، سب کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

دفعہ (۴)

اگر کسی قانون کے متعلق عوام اور حکام میں اختلاف ہو کہ وہ موافق شریعت ہے یا خلاف شرع تو اس کا فیصلہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کر کے کیا جائے گا جس کی عملی صورت ماہرینِ کتاب وسنت کے فیصلہ کو آخری فیصلہ قرار دینا ہے، خواہ ماہرینِ شریعت کا کوئی مستقل بورڈ بنا دیا جائے یا ایسے حضرات کو اسمبلی میں یا عدالت میں لیا جائے، ان میں سے جو صورت خطرات سے پاک سمجھی جائے اس کو اختیار کیا جائے۔

آیت (۱۲): يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (۵۹:۴)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! کہا مانو اللہ کا اور کہا مانو رسول اللہ کا اور اپنے حاکموں کا بھی جو تم میں سے (یعنی مسلمان) ہوں، پھر اگر تمہارے آپس میں کسی حکم کے متعلق اختلاف ہو جائے تو اس کو حوالہ کرو اللہ اور رسول کے اگر تم اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہو''

آیت میں اولی الامر کا لفظ اپنے مفہومِ لغوی کے اعتبار سے ہر اس جماعت کو شامل ہے جس کے ہاتھ میں قوم کی باگ اور اجتماعی نظام ہو وہ علماء بھی ہو سکتے ہیں اور حکام وامراء بھی، صحابہ وتابعین کی ایک جماعت نے اس جگہ اولی الامر سے حکام ہی کا مراد ہونا بیان فرمایا ہے اسی کے موافق ترجمہ حاکموں سے کیا گیا ہے۔

اللہ و رسول کے حوالہ کرنے کا مطلب اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے تمام نزاعات کے فیصلے کا معیار قرار دیا جائے اور اس کی عملی صورت تمام فنی (ٹیکنیکل) مسائل کی طرح یہی ہو سکتی ہے کہ ماہرین کتاب وسنت کے فیصلہ کو آخری فیصلہ مانا جائے۔

دفعہ (۵)

(الف) طرز حکومت جمہوری شورائی ہوگا،

(ب) امیر مملکت کا عزل ونصب جمہور کے اختیار میں ہوگا جس کو وہ اپنے نمائندوں (اہل حل وعقد) کے ذریعہ استعمال کریں گے،

آیت (۱۳): وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۳۸:۴۲)

ترجمہ: ''اور کام کرتے ہیں مشورہ سے آپس کے۔''

آیت (۱۴): وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (۱۵۹:۳)

ترجمہ: (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ) ان سے (یعنی صحابہ سے) مشورہ لے کام میں، پھر جب قصد کر چکا تو اس کام کا تو پھر بھروسہ کر اللہ پر، اللہ کو محبت ہے توکل والوں سے۔''

پہلی آیت میں بتلایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے کام مشورے سے ہونے چاہئیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی تشریح سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد مہمات امور ہیں، معمولی کاموں کو مشورہ پر موقوف رکھنا فضول بھی ہے اور موجبِ تکلیف بھی، اور مہماتِ امور میں سب سے اہم وہ کام ہیں جن پر ملت کی اجتماعی زندگی کا مدار ہے یعنی امورِ سلطنت جن میں اہم الامور امیر المملکت کا عزل ونصب ہے۔

دوسری آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابۂ کرام سے مشورہ لینے کا حکم ہے، آپ ﷺ بوجہ وحی الٰہی اگرچہ اس کے محتاج نہ تھے مگر تعلیم امت کے لئے آپ کو بھی اس کا امر فرمایا گیا، چنانچہ آپ کا عمل ہمیشہ اس پر رہا اور آپ کے بعد یہ سنت جاری ہوئی اور خلافت

راشدہ کی تو بنیاد ہی شوریٰ پر قائم تھی، باقی رہی شوریٰ کی تفصیلات کہ مجلس شوریٰ (اسمبلی) کس طرح مرتب کی جائے، ارکانِ شوریٰ میں اختلاف ہو تو فیصلہ کثرتِ رائے سے کیا جائے یا امیر کی صوابدید پر؟ یہ تفصیلات رسولِ کریم ﷺ کے ارشادات وتعامل سے ثابت ہیں جو اس وقت موضوعِ بیان سے خارج ہیں۔ مکمل دستور مرتب کرنا ہو تو ان روایاتِ حدیث کو شامل کرنا ضروری ہوگا۔

دفعہ (۶)

حکومت کے مروّجہ طریقوں میں سے صدارتی طرزِ حکومت اسلام کے مزاج اور اصول سے قریب تر ہے۔

آیت ⑮: **يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ** (۲۶:۳۸)

ترجمہ: "اے داؤد ہم نے آپ کو زمین کا خلیفہ بنادیا، سو آپ لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ اللہ کے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق کیا کریں۔"

اس آیت کے مطابق حکم وفیصلہ کی ذمہ داری خلیفۂ وقت (امیر المومنین) پر ڈالی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ پارلیمانی طرز میں امیرِ مملکت پر کوئی ایسی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، یہ صرف صدارتی طرز میں ہوسکتی ہے۔

علاوہ ازیں مذکور الصدر آیت ۱۲ میں اسلامی ریاست کے اولوالامر کا مسلم ہونا شرط ہے اور موجودہ دنیا میں اس شرط پر عمل صدارتی طرزِ حکومت میں آسانی ہوسکتا ہے جس میں ولایت امر اور اقتدار اصلی صدرِ مملکت کا ہوتا ہے اس کے لئے مسلمان ہونے کی شرط عملاً سہل ہے بخلاف پارلیمانی نظام کے کہ اس میں صدرِ مملکت محض ایک نمائشی چیز ہے، اصل اقتدار صرف پارلیمان کا ہوتا ہے اور پوری پارلیمان میں کسی غیر مسلم کو شامل نہ کرنا عملاً دشوار ہے اس لئے بھی صدارتی طرزِ حکومت اصولِ اسلام سے قریب تر ہے۔

حکومت کے فرائض

دفعہ (۷)

ہرگاہ کہ مملکت کے تمام عہدے، تمام اموال وخزائن حکام کے ہاتھ میں بطور امانت ہیں، وہ ان کے مالک ومختار نہیں، اور ان امانتوں کے اہل ومستحق جمہور عوام (باشندگانِ مملکت) ہیں، اس لئے حکومت کی ذمہ داری ہے:-

(الف) ان امانتوں کے مستحقین کو تحقیق وتلاش کرکے پہنچائے،

(ب) ہر امانت اس کے مستحق کو پہنچائے، غیر مستحق کے قبضہ سے بچائے،

دفعہ (۸)

مقدمات کا فیصلہ بلا امتیاز مذہب ونسل ورنگ ووطن پورے انصاف کے ساتھ کرے،

دفعہ (۹)

انصاف مفت ہونا چاہئے، اصحابِ معاملہ سے کسی قسم کا معاوضہ کورٹ فیس وغیرہ وصول نہ کرے۔

آیت ⑯: **اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا** (۵۸:۴)

ترجمہ: "بیشک اللہ تعالیٰ تم کو اس کا حکم دیتے ہیں کہ اہلِ حقوق کو ان کے حقوق پہنچایا کرو اور یہ کہ جب لوگوں کا تصفیہ کیا کرو تو عدل وانصاف کے ساتھ کیا کرو بیشک اللہ تعالیٰ تم کو جس بات کی نصیحت کرتے ہیں وہ بات بہت اچھی ہے، بلاشک اللہ تعالیٰ خوب سنتے ہیں خوب دیکھتے ہیں۔"

دفعہ ۷ سے دفعہ ۹ تک کے تمام مضامین اس آیت سے ثابت ہیں اور عنوانِ بیان میں

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ کے اختیار کرنے سے اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ امر وحکم اصل میں صرف اللہ کا ہے، دنیا کے امیر و رئیس سب مامور ہیں، اس سے دفعہ ۲ مذکور الصدر کا مضمون بھی ثابت ہوگیا۔

اس میں پہلے یہ سمجھنا ہے کہ لفظ اَمَانَاتْ جو بصیغہ جمع لایا گیا ہے اس سے کس کس قسم کی امانتیں مراد ہیں؟ ہماری زبان میں عموماً امانت اس مال کو کہتے ہیں جو کسی معتمد کے پاس حفاظت کے لئے رکھا جائے لیکن عربی زبان میں امانت کا مفہوم اس سے بہت عام ہے کسی شخص نے کسی کو راز دار بنا کر کوئی راز کہہ دیا اس کو بھی حدیث میں امانت فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے **المجالس بالامانة**، اسی طرح مشورہ دینے والے کو مشورہ دینا بھی حدیث میں امانت قرار دیا ہے کہ اپنے نزدیک جو بات صحیح و مفید ہو اس کے خلاف مشورہ دینا خیانت ہے، حدیث میں ہے **المستشار مؤتمن** یعنی جس سے کوئی مشورہ لیا جائے وہ امین ہے، اس کو صحیح مشورہ دینا چاہئے، اسی مفہوم عام کے اعتبار سے حدیث میں فرمایا گیا ہے **لا ایمان لمن لا امانة له** یعنی جس میں امانت داری نہیں اس کا ایمان نہیں، اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے **ان الامانة نزلت فی جذر قلوب المؤمنین** یعنی صفت امانت اللہ تعالیٰ نے مومن کے دل میں اتار دی ہے، ان تمام ارشادات سے معلوم ہوا کہ جس طرح مالی امانت ایک امانت ہے اسی طرح جس چیز کی ذمہ داری کسی شخص پر عائد ہو وہ بھی امانت ہے، انہیں مختلف اقسام امانات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے امانات بصیغہ جمع لایا گیا ہے، اور اسی لئے آیتِ مذکورہ میں امانات کی تفسیر یہ کی گئی ہے،

ان الامانات جمع امانة یعم الحقوق المتعلقة بذمهم من حقوق الله تعالیٰ وحقوق العباد وقدروی مایدل علی العموم عن ابن عباس وأبیّ وابن مسعود و البراء بن عاذب وأبیّ جعفر وابی عبدالله (روح المعانی)

یعنی امانات امانت کی جمع ہے جو تمام حقوق واجبہ کو عام اور شامل ہے خواہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد اور امانت کے یہ عام معنی حضرات صحابہ کی ایک عظیم

جماعت سے منقول ہیں مثلاً ابن عباس، ابی بن کعب، ابن مسعود، براء بن عاذب، ابوجعفر، ابوعبداللہ وغیرہ،

دوسری بات اس آیت میں یہ سمجھنا ہے کہ یامرکم کا خطاب کس کو ہے، اس میں بعض حضرات صحابہ نے تمام مسلمانوں کو خواہ حکام ہوں یا عوام اس خطاب میں شامل قرار دیا ہے اور بعض حضرات نے اس کا مخاطب خاص حکام اور سلطنت کے ذمہ داروں کو قرار دیا ہے، حضرت زید بن اسلمؓ وغیرہ نے خاص حکام کے مخاطب ہونے کو ترجیح دی ہے، جس کا قرینہ یہ ہے کہ اسی آیت کا دوسرا جز مقدمات کے فیصلہ سے متعلق ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ مقدمات کا فیصلہ عوام کا کام نہیں' نیز اس کے بالمقابل دوسری آیت یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے شروع ہوتی ہے، جس کا مخاطب عام مومنین کا ہونا ظاہر ہے، تو مقابلہ کا مقتضا یہ ہے کہ پہلی آیت کا مخاطب خاص حکام ہوں اور دوسری کا عوام، اسی لئے حضرت زید بن اسلمؓ نے فرمایا

ان هذاالخطاب لولاة الامران یقوموابرعایة الرعیة وحملهم علی موجب الدین والشریعة وعدوا من ذالک تولیة المناصب مستحقیها. (روح ص ۶۴ ج ۵)

”یہ خطاب خاص اولوالامر (حکام) کو ہے کہ وہ حفاظتِ رعیت کا مکمل انتظام کریں اور ان کو مقتضیات دینِ اسلام کا پابند بنائیں' امانات میں اس کو بھی شمار کیا ہے کہ عہدے صرف ان کے مستحقین کو دیئے جائیں“

علاوہ ازیں یہ خطاب خواہ حکام کے لئے مخصوص ہو یا عوام و حکام دونوں کو عام و شامل ہو، بہرحال حکام و امراء کا اس خطاب میں شامل ہونا سب کے نزدیک مسلّم و متفق علیہ ہے

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آیت میں امانات سے مراد تمام ذمہ داریاں اور جملہ حقوقِ واجبہ ہیں جن میں حسبِ تصریح حضرت زید بن اسلمؓ حکومت کے عہدے بھی داخل ہیں۔

آیت کا شانِ نزول بھی اسی کا مؤید ہے، کیونکہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کہ فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کے قدیم دربان عثمان بن طلحہؓ سے بیت اللہ کی کنجی طلب فرمائی اور دروازہ کھول کر اندر تشریف لے جانے کا ارادہ کیا، اس وقت چند

حضرات صحابہ حضرت عباسؓ وحضرت علیؓ نے یہ درخواست کی کہ جس طرح حرم کعبہ کا عہدۂ سقایہ (یعنی آب زمزم کا انتظام) پہلے سے ان کے سپرد تھا، اسی طرح یہ عہدہ حجابت (دربانی) بھی ان کے حوالہ کر دیا جائے اور بیت اللہ کی کنجی ان کے سپرد کر دی جائے، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی جس میں عہدۂ حجابت (دربانی) کو ایک امانت قرار دے کر صاحبِ امانت یعنی عثمان بن طلحہؓ کو واپس کرنے کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا اور جب بیت اللہ شریف کے اندر سے فارغ ہو کر نکلے تو یہ آیت آپ کی زبان پر تھی اور اس ارشاد کے مطابق آپ نے کنجی عثمان بن طلحہؓ کو واپس فرمائی اور انہیں کو عہدۂ حجابت پر برقرار رکھا، ظاہر ہے کہ حضرت عباسؓ وحضرت علیؓ کی درخواست چار پیسے قیمت کی کنجی کے لئے نہ تھی، بلکہ عہدۂ حجاب کے واسطے تھی، اسی عہدے کو قرآن میں امانت سے تعبیر کر کے صاحب امانت کو واپس دینے کی تلقین کی گئی، معلوم ہوا کہ حکومت کے عہدے بھی امانات میں داخل ہیں،

آیت مذکورہ کی تفسیر اور صحیح مفہوم معلوم کرنے کے بعد اس کے مضامین کا تجزیہ کیا جائے تو نظامِ مملکت کے متعلق امورِ ذیل مستفاد ہوتے ہیں:۔

(الف) حکومت کے تمام اموال وخزائن اور عہدے اور منصب حکام وامراء کے ہاتھ میں بطور امانت ہیں وہ ان کے مالک ومختار نہیں۔

(ب) یہ امانتیں اگرچہ حکام کے قبضہ میں ہیں لیکن ان امانتوں کا اہل اور مستحق کچھ اور لوگ یعنی جمہور وعوام ہیں، جیسا کہ لفظ اِلٰٓی اَھْلِھَا سے واضح ہے۔

(ج) لفظ اِلٰٓی اَھْلِھَا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص ہر امانت کا اہل نہیں، لوگوں کی صلاحیتیں مختلف ہیں، حاملینِ امانت کا فرض ہے کہ ہر امانت کے اہل کو پہچانیں اور اس کو پہنچائیں۔

(د) اَنْ تُؤَدُّوْا کے لفظ سے امانتوں کے پہنچانے کی ذمہ داری حاملینِ امانت (حکام) پر ڈالی گئی ہے، یہ نہیں کہ کوئی مستحق درخواست یا مطالبہ لے کر آئے تو دیدو، یعنی لوگوں کو اپنی امانت وصول کرنے کے بجائے امینوں کو ایصالِ امانت کی تلقین کی گئی ہے۔

(ہ) اور جب کہ امانت کا اس کے مستحق اہل کو پہنچانا فرائض حکومت میں داخل ہوا تو غیر مستحق نااہل کو دیدینا خیانت ہوئی، اس تجزیہ کے بعد یہ سمجھنا سہل ہو گیا کہ آیت مذکورہ کے ابتدائی ایک جملہ سے دستورِ مملکت کی دفعات ذیل ثابت ہوگئیں،

(۱) مملکت کا اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، جیسا کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ کے الفاظ سے ثابت ہے۔

(۲) اسلامی ریاست کے امیر یا صدر کی حیثیت ایک نائب امین کی حیثیت ہے، اس کے ہاتھ میں جو کچھ سلطنت کے خزائن یا عہدے اور منصب ہیں وہ بطور امانت اس کے قبضہ میں ہیں، وہ ان کا مالک ومختار نہیں، یہ وہی مضمون ہے جو دفعہ نمبرے کے شروع میں لکھا گیا ہے۔

(۳) جو امانتیں حکومت کے سپرد کی گئی ہیں ان کے اہل (یعنی بعطائے الٰہی مالک و مستحق) جمہور عوام ہیں۔

(۴) حکام کی ذمہ داری ہے کہ عہدوں کی تقسیم میں ہر عہدہ کے اہل و مستحق کو خود تلاش کرے، کوئی عہدہ کسی نااہل غیر مستحق کو سپرد نہ کرے۔

(۵) عوام کے حقوق عوام کو پہنچانا خود حکومت کی ذمہ داری ہے، درخواست و مطالبہ پر ادائے حقوق کا مدار رکھنا اپنے فرض میں کوتاہی اور بہت سی انتظامی خرابیوں کا موجب ہے، آیت میں اِلٰٓی اَھْلِھَا سے یہ مفہوم ثابت ہے، اس کی مزید توضیح تشریحات میں ملاحظہ کی جائے۔

یہاں تک آیت مذکورہ کے پہلے جملے کی تشریح تھی، دوسرے جملے وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ میں لفظ بَیْنَ النَّاسِ فرمایا گیا ہے بَیْنَ الْمُسْلِمِیْنَ نہیں، اس سے ثابت ہوا کہ عدل وانصاف میں کسی مذہب وملت یا نسل ورنگ یا خطہ وصوبہ کا امتیاز روا نہیں، سب کے ساتھ یکساں معاملہ کرنا فرض ہے، پھر عدل وانصاف کے خلاف کسی انسان کو آمادہ کرنے کے عموماً تین سبب ہوا کرتے ہیں' ایک کسی فریق کی دشمنی، دوسرے اپنی کوئی ذاتی غرض، تیسرے کسی فریق کی دوستی، قرآن کریم نے ان تینوں اسبابِ ظلم کو رفع کرنے کے لیے دو مستقل آیتیں نازل فرمائیں' ایک سورۂ مائدہ میں

وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَنۡ لَّا تَعۡدِلُوۡا

(۸:۵)

یعنی ''تمہیں کسی قوم کی دشمنی و بغض انصاف کے خلاف کرنے پر آمادہ نہ کردے۔'' اور دوسری نساء میں

کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُہَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَوِ الۡوَالِدَیۡنِ وَالۡاَقۡرَبِیۡنَ

(۱۳۵:۴)

یعنی ''تم انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو، اگرچہ اپنی ہی ذات کے خلاف ہو یا والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے خلاف ہو۔''

اور جب کہ عدل و انصاف کو حکومت کے فرائض میں داخل کیا گیا تو اہل معاملہ سے اس پر کوئی معاوضہ (کورٹ فیس وغیرہ) لینا رشوت و حرام ٹھہرا، جیسے کوئی سرکاری ملازم اپنی ڈیوٹی ادا کرنے کے لئے اہلِ معاملہ سے معاوضہ طلب کرے۔

آیت کی مذکورالصدر تفصیل سے واضح ہوگیا کہ دستورِ مملکت کی دفعہ (۲، ۷، ۸، ۹) اسی ایک آیت سے بوضاحت ثابت ہوگئیں۔

دفعہ (۱۰)

حکومت کا فرض ہے کہ کسی باشندۂ ملک کی جائز آزادی کو سلب نہ کرے جب تک اس پر کوئی جرم ثابت نہ ہو اور اس کو صفائی کا موقع نہ دیا جائے، اس لئے مروجہ سیفٹی ایکٹ اصولِ اسلام کے خلاف ہے۔

ظاہر ہے کہ بلا اثبات جرم کسی شخص کو سزا دینا یا قید کرنا عدل و انصاف کے خلاف ہے، اور قرآن مجید کی بیشمار آیات عدل و انصاف کی تاکید کے لئے نازل ہوئی ہیں، مذکورالصدر آیات میں سب سے پہلی آیت میں نیز سورۂ نساء کی آیت ۱۶ میں بھی یہ مضمون گذر چکا ہے، نیز ارشاد ہے:۔

آیت ⑰: **یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰہِ شُہَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَنۡ لَّا تَعۡدِلُوۡا اِعۡدِلُوۡا ہُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی،**

(۸:۵)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ کے لئے پوری پابندی کرنے والے، انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے رہو اور کسی خاص گروہ کی عداوت تمہیں اس پر باعث نہ ہوجاوے کہ تم عدل نہ کرو، عدل ہی کیا کرو کہ وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔''

اس آیت میں واضح کردیا گیا ہے کہ کوئی آدمی جو تمہاری پارٹی یا تمہاری قوم کا بھی نہ ہو اس کے ساتھ بھی انصاف لازم ہے۔

آیت ⑱: **یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُہَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَوِ الۡوَالِدَیۡنِ وَالۡاَقۡرَبِیۡنَ** (۱۳۵:۴)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو اگرچہ اپنی ہی ذات کے خلاف ہو یا کہ والدین اور دوسری رشتہ داروں کے خلاف ہو''

تنبیہ: خلاف انصاف فیصلہ کرنے پر تین چیزیں کسی انسان کو آمادہ کرسکتی ہیں، ایک کسی فریق کی دشمنی و بغض، دوسرے اپنی ذاتی غرض، تیسرے کسی فریق کی دوستی و محبت، آیت ۱۷ میں پہلے سبب کی جڑ کاٹ دی گئی، اور آیت ۱۸ میں دوسرے اور تیسری سبب کی۔

آیت ⑲: **وَاِنۡ حَکَمۡتَ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِالۡقِسۡطِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ**

(۴۲:۵)

ترجمہ: ''اور اگر آپ غیر مسلموں کے معاملہ میں فیصلہ کریں تو انصاف سے کریں، بیشک اللہ دوست رکھتا ہے انصاف کرنے والوں کو''

قرآنِ کریم نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی شریر، ظالم، بدمعاش کیوں نہ ہو مگر اس کے حق میں بھی تمہارا دامنِ عدالت ناانصافی کی چھینٹوں سے داغدار نہ ہونے پائے۔

اسی وجہ سے حضرت فاروق اعظمؓ نے ارشاد فرمایا۔

والله لا يوسر رجل في الاسلام الا بالعدول (مولا امام مالک کتاب الشہادۃ ص ۳۰۰)

یعنی ''بخدا اسلام میں کسی آدمی کو قید نہ کیا جائے گا جب تک اس کے خلاف عدولی یعنی ثقہ لوگوں کی شہادت سے جرم ثابت نہ ہو جائے''

(کذافی شرح الزرقانی ص ۳۸۸، ج ۳)

اس سے ثابت ہوا کہ محض پولیس کی رپورٹ پر کسی کو قید نہیں کیا جاسکتا جب تک اس پر باقاعدہ عدالت میں ثقہ اور قابل اعتماد شہادتوں سے جرم ثابت نہ کر دیا جائے، اس کے یہ معنی نہیں کہ متہم، ملزم کو حراست میں نہ لیا جائے اور اس کو بھاگ جانے کا موقع دیا جائے، بلکہ حاصل یہ ہے کہ حراست میں لینے کے بعد اس کے جرم کی تحقیقات کر کے کسی باقاعدہ عدالت کے سامنے اس کا جرم ثابت کرنے سے پہلے اس کو کسی معینہ مدت کے لئے قید نہیں کیا جاسکتا، تاتحقیقاتِ حراست میں رکھنا اس کے منافی نہیں، اسی طرح اگر کوئی ایسا مجرم ہے کہ اس کے جرم کے افشاء سے ملک وملت کے لئے کوئی خطرہ ہے تو اس کا بیان عدالت کے بند کمرے میں لیا جاسکتا ہے اور مقدمہ کی کارروائی کو بصیغۂ راز رکھا جاسکتا ہے۔

دفعہ (۱۱)

اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ ہر مسلمان باشندۂ ملک کو ضروریاتِ دین سے واقف کرنے کا انتظام کرے۔

آیت نمبر 1 میں اسلامی حکومت کی غرض یہ بتلائی گئی ہے کہ لوگ عدل واعتدال پر قائم ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ احکامِ شریعہ سے واقفیت کے بغیر لوگوں کا عدل واعتدال پر قائم رہنا ممکن نہیں، اس لئے اس غرض کو پورا کرنے کے لئے ضروریاتِ دین کی جبری تعلیم دینے کا فریضہ حکومت پر عائد ہوتا ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بہ نفس نفیس اس خدمت کو انجام دیا اور ارشاد فرمایا **انما بعثت معلما** (میں معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں) دوسری مسلم بستیوں میں معلمین بھیجنے کا یہی معمول رہا ہے، ہجرت سے پہلے بھی جب مدینہ طیبہ میں کچھ لوگ مسلمان ہو

گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب بن عمیرؓ کو ان کی تعلیم کے لئے بھیج کر اسلام کا سب سے پہلا مدرسہ مدینہ میں قائم فرما دیا، خلفائے راشدین اپنے اپنے زمانوں میں جن حضرات کو صوبوں کا عامل بنا کر بھیجتے تھے ان پر مسلمانوں کو ضروریاتِ دین کی تعلیم کی ذمہ داری بھی ہوتی تھی۔

دفعہ (۱۲)

مملکت کے لئے لازم ہونا چاہئے کہ مسلمانوں میں سے جغرافیائی، قبائلی، نسلی اور لسانی اور اسی قسم کے دوسرے غیر اسلامی تعصبات کو دور کرنے اور ملتِ اسلامیہ کی وحدت واستحکام کے لئے کوشش کرے۔

آیت (۱۹) : **هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ**
(۲:۶۴)

ترجمہ: اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا پھر تم میں دو گروہ ہو گئے ایک مومن اور ایک کافر''

آیت (۲۰) : **اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ** (۴۹:۱۰)

ترجمہ: بیشک سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں''

آیت (۲۱) : **وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِندَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ** **(۴۹:۱۳)**

آیت ۱۹ میں بتلا دیا گیا کہ قوموں کی تقسیم ایمان وکفر سے ہوتی ہے، آیت ۲۰ میں بتلا دیا گیا کہ مسلمان خواہ کسی ملک ووطن کا باشندہ ہو کوئی زبان بولتا ہو وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

آیت ۲۱ میں واضح کر دیا گیا کہ جغرافیائی اور قبائلی امتیازات حق تعالیٰ نے صرف تعارف کے لئے رکھے ہیں، حقوق اور درجات کی تقسیم ان بنیادوں پر نہیں ہوگی اور نہ ان بناؤں پر قومیت کی وحدت وجدائی موقوف ہے۔

دفعہ (۱۳)

اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ غیر مسلم باشندگانِ ملک کی جان، مال، آبرو کی اسی طرح حفاظت کریں جس طرح مسلمان کی کی جاتی ہے۔

آیت ۲۲ : یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۔ (۵:۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو۔"

آیت ۲۳ : وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ

(۷۰:۳۲)

ترجمہ: اور وہ لوگ اپنی امانتوں اور وعدوں کی رعایت کرتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں کئے ہوئے معاہدات کی پابندی سب مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو غیر مسلم کسی اسلامی حکومت کے شہر میں ہیں ان سے قولی یا عملی طور پر اس کا معاہدہ ہوتا ہے کہ ان کی جان، مال، آبرو کی حفاظت کی جائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس معاملہ میں نہایت واضح اور مؤکد ہیں، حدیث میں ہے۔

من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة وان ريحها يوجد من مسيرة اربعين عاماً

ترجمہ: جو شخص کسی معاہد کو قتل کردے اس کو جنت کی خوشبو تک نصیب نہیں ہوگی، حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت تک پہنچتی ہے۔

اور ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے قیامت کے روز میں اس کی طرف سے ظالم کے خلاف پیروی کروں گا۔

دفعہ (۱۴)

جو معاہدہ کسی قوم یا ملک یا جماعت سے کرلیا جائے اس کی پوری پابندی حکومت پر لازم

ہے، ظاہراً یا باطناً اس کی کسی شرط کے خلاف کرنا جرم ہے جب تک کہ معاہدہ کی میعاد پوری نہ ہو جائے یا اس معاہدے کو باقاعدہ ختم نہ کردیا جائے۔

آیات مندرجہ ۱۹ اور ۲۰ اس پر شاہد ہیں اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق سخت تاکیدی احکام دیئے ہیں، ترمذی اور ابوداؤد میں سلیم بن عامرؓ کی روایت ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ اور رومی غیر مسلموں میں ایک معین میعاد تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ تھا، حضرت معاویہؓ نے یہ صورت کی کہ اندرون میعاد اپنا لشکر سرحد روم پر پہنچا دیا اور میعادِ صلح ختم ہوتے ہی دشمن پر حملہ کردیا، عین اس وقت جب کہ اسلامی لشکر حضرت معاویہؓ کی سرکردگی میں فاتحانہ بڑھ رہا تھا پیچھے سے ایک آواز آتی ہے **الله اكبر الله اكبر وفاء لا غدر** یعنی "اللہ اکبر اللہ اکبر مسلمانوں کو عہد پورا کرنا چاہئے، عہد شکنی جائز نہیں

حضرت معاویہؓ نے پھر کر دیکھا تو عمر بن حبسہؓ صحابی ہیں، ان سے دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے

من كان بينه وبين قوم عهد فلا يحلن عهد اولا يشد نه حتى يمضى امده اوينبذ اليهم على سواء قال فرجع معاوية بالناس

(مشکوۃ باب الامان)

ترجمہ: "جس شخص کا کسی دوسری قوم سے معاہدہ صلح کا ہو تو معاہدہ کی میعاد گذرنے سے پہلے کسی سامان کو باندھے نہ کھولے یا یہ کہ اس معاہدہ کو باقاعدہ واپس کردیا جائے"

مطلب یہ تھا کہ میعادِ صلح کے اندر لشکر کشی کر کے سرحد روم تک لے آنا یہ بھی ایک گونہ معاہدہ کی خلاف ورزی ہے، حضرت معاویہؓ نے یہ سن کر لشکر کو واپسی کا حکم دیدیا، اور سب واپس آگئے۔

دفعہ (۱۵)

کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائیگا بلکہ اس کو اپنی مذہبی رسوم کی ادائیگی

میں مکمل آزادی ہوگی

آیت ۲۴: لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ
(۲۵۶:۲)

ترجمہ: ''دین میں زبردستی نہیں، ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے''

دفعہ (۱۶)

حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ملک کی وہ دولت جس میں سب کے حقوق مساوی ہیں ان کی تقسیم اس طرح کرے کہ تمام اہل ملک اور ان کی آئندہ نسلیں اس سے فائدہ اٹھا سکیں، ایسا نہ ہو کہ اس دولت پر صرف سرمایہ دار قبضہ کر لیں یا اس طرح تقسیم ہو کہ کچھ لوگ سرمایہ دار بن جائیں اور دوسرے محروم رہ جائیں۔

آیت ۲۵: مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (۷:۵۹)

ترجمہ: ''جو کچھ اللہ اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے لوگوں سے دلوادے وہ اللہ کا حق ہے اور رسول کا اور قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور غریبوں کا اور مسافروں کا تاکہ وہ تمہارے سرمایہ داروں کے قبضہ میں نہ آجائے''

اس آیت میں مال و دولت کا ذکر ہے جو بغیر جنگ و جہاد کے مسلمانوں کو ہاتھ آجائے جس کو اصطلاح میں ''فئی'' کہا جاتا ہے، اس میں چونکہ فوج یا مجاہدین کو کوئی محنت اٹھانی نہیں پڑی، اس لئے یہ اموال ان میں تقسیم نہ کئے جائیں گے، بلکہ تمام مسلمانوں کے حقوق ان میں مساوی ہوں گے۔ (احکام القرآن للجصاص وہدایہ) اسی طرح جنگ و جہاد کے ذریعہ حاصل شدہ غیر منقولہ جائداد و آراضی کا بھی حسبِ فرمانِ فاروق اعظم واتفاق رائے جمہور صحابہ کا یہی حکم ہے کہ وہ صرف مجاہدین کا حق نہیں، ان میں تمام موجود و آئندہ آنے والے مسلمانوں کے حقوق ہیں (احکام القرآن للجصاص) پھر ان اموال میں جو تفصیل آیت میں مذکور ہے اس

میں اللہ تعالیٰ کا حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس طرح چاہے ان میں حکم دے، اس کو اختیار ہے جیسا کہ اور سب چیزوں میں بھی اس کو اسی طرح حق حاصل ہے اور رسول کا حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اموال عہدِ رسالت میں خالص رسول ﷺ کے اختیار و تصرف میں رہیں گے، پھر ممکن ہے کہ یہ اختیار مالکانہ ہو اور احتمال ہے کہ محض حاکمانہ ہو، بہرحال اللہ تعالیٰ نے ان اموال کے متعلق آپ کو اگلی آیت میں ہدایت فرمادی کہ وجوباً یا ندباً فلاں فلاں مصارف میں صرف کئے جائیں، آپ کی وفات کے بعد یہ اموال امام اور امیر المومنین کے اختیار و تصرف میں جائیں گے جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب وخلیفہ ہے، لیکن اس کا تصرف مالکانہ نہیں ہوگا محض حاکمانہ ہوگا، وہ ان اموال کو مسلمانون کے مصالح عامہ اور عام ضروریات میں صرف کرے گا۔ (بیان القرآن وغیرہ)

دفعہ (۱۷)

انفرادی ملکیتیں جو جائز طریقوں سے حاصل کی گئی ہوں وہ کسی سے ناحق سلب نہ کی جائیں گی۔

آیت ۲۶: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ (۲۹:۴)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے۔''

قرآن کی بے شمار آیات ہیں جو شخصی ملکیت کے احترام کو واجب قرار دیتی ہیں مثلاً

لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓی اَمْوَالِکُمْ (۲:۴)

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَکُمْ قِیٰمًا (۵:۴)

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا (۱۰:۴)

وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَی الْحُکَّامِ لِتَاْکُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ (۱۸۸:۲)

اسی مضمون کو حدیث میں فرمایا ہے:

الا لا تظلموا الا لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس منه .

(مشکوٰۃ)

ترجمہ: خبردار! کسی مسلمان کا مال بغیر اس کی رضامندی کے حلال نہیں ہوسکتا۔

اسی وجہ سے جمہور فقہائے امت کا ضابطہ اس معاملہ میں وہ ہے جو قاضی ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ:۔

لیس للامام ان یخرج شیئا من ید احد الا بحق ثابت معروف

(شامی ص ۳۵۴، ج ۳)

ترجمہ: امیر المومنین کے لئے جائز نہیں کہ کسی کے قبضہ سے کوئی چیز نکال لے بجز اس کے کہ اس کے خلاف کوئی حق ثابت ومعروف ہو۔''

ایک مرتبہ سلطانِ مصر ملک الظاہر بیبرس نے مصر کی زمینوں کے متعلق یہ قانون جاری کرنا چاہا تھا کہ ''جو لوگ ان زمینوں پر قابض ہیں وہ اپنی ملکیت کا ثبوت پیش کریں، اگر ایسا ثبوت پیش نہ کریں گے تو یہ زمین بحق حکومت ضبط کر لی جائے گی'' اس زمانہ کے عام علماء اور شیخ الاسلام محی الدین نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے اس تصرف کو ناجائز قرار دیا اور ان کو یہ قانون واپس لینا پڑا۔ (شامی)

صدرِ مملکت کے اوصاف

دفعہ (۱۸)

(الف) مسلمان ہو کافر نہ ہو

(ب) نیک عمل ہو، فاسق معلن نہ ہو،

(ج) علمی اور عملی قابلیتوں میں ممتاز سمجھا جاتا ہو۔

(د) اپنے زمانہ کی سیاست سے اتنا واقف ہو کہ داخلی اور خارجی فتنہ وفساد کی روک تھام کر سکے۔

مذکورہ سابق آیت سورۂ نساء ۱۲ میں جہاں عوام کو اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اولوالامر مسلمان ہوں (اولی الامر منکم) یعنی وہ امیر جو مسلمانوں میں سے ہوں۔

آیت (۲۷): **قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَاماً قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ۔** (۲:۱۲۴)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے (ابراہیمؑ سے) فرمایا کہ میں آپ کو لوگوں کا مقتدا بناؤں گا، انھوں نے عرض کیا کہ میری اولاد میں سے بھی (یہ درجہ عنایت کیجئے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا عہدہ خلاف ورزی کرنیوالوں کو نہ ملے گا۔''

خلاف کرنے کا انتہائی درجہ کفر ہے، دوسرا فسق وفجور، اس سے معلوم ہوا کہ کافر یا فاسق معلن کو مقتدا اور امیرِ مملکت نہیں بنایا جاسکتا ان دونوں آیتوں سے امیرِ مملکت کا وصف (الف) و(ب) بوضاحت ثابت ہوگیا۔

اور یہ بات جیسے مذکور الصدر آیات قرآنی سے ثابت ہے، خود عقلی اور فطری بھی ہے کہ جو سلطنت کسی خاص نظریہ اور اصول پر بنائی گئی ہو اس کا سربراہِ کار اس شخص کو نہیں بنایا جا سکتا جو اس نظریہ اور اصول ہی سے اتفاق نہ رکھتا ہو۔

آج کی جمہوریت نواز دنیا اور جمہوریت کے بڑے سے بڑے علمبردار بھی اس اصول سے دست بردار ہونے کے لئے کبھی تیار نہیں ہو سکتے، اگر امریکہ کی جمہوریت کا صدر کسی اشتراکی عقیدہ رکھنے والے کو اور روسی جمہوریت کا صدر کسی امریکی نظام پر اعتقاد رکھنے والے کو نہیں بنایا جا سکتا، تو اسلامی حکومت میں خدا اور رسول کے منکر کو صدرِ مملکت بنانے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے، پاکستان کی بنیاد چونکہ مسلم اور غیر مسلم دو قومی نظریہ پر رکھی گئی ہے، اس لئے کوئی پاکستانی اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کہ اس بنیاد کے منکر متحدہ قومیت کے دعویدار کو پاکستان کا صدر تسلیم کریں، یہ ساری چیزیں جمہوریت کے خلاف نہیں سمجھی جاتیں تو اسلامی مملکت میں صدرِ مملکت کے لئے مسلم ہونے کی شرط کو کیسے کوئی خلافِ جمہوریت کہہ سکتا ہے۔

الغرض آیات مذکورہ سے وصف (الف) و (ب) کا ضروری ہونا ثابت ہو گیا۔

آیت (۲۸): قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ

(۲۴۷:۲)

ترجمہ: "(جب بنی اسرائیل کے کسی نبی نے ان کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ بنا دیا ہے تاکہ تم اس کے زیرِ علم اپنے مخالفین سے جہاد کرو، تو) وہ کہنے لگے کہ طالوت کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہو سکتا ہے، حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں اور ان کو تو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی، ان پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلہ میں ان کو منتخب فرمایا ہے اور علم اور جسامت میں ان کو زیادتی دی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنا ملک جس کو چاہیں دیں، اور وہی علیم و خبیر ہیں۔"

اس آیت میں طالوت کے حکمران ہونے کی اہلیت میں سب سے پہلی بات تو یہ فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا انتخاب فرمایا ہے، دوسری بات یہ بتلائی کہ ان کے دو وصف بھی ایسے ہیں جن کی وجہ سے وہ مستحقِ حکمرانی سمجھے گئے، اور وہ دو یہ ہیں (۱) علم میں ان کا دوسروں سے ممتاز ہونا (۲) جسمانی طاقت و قوت میں ممتاز ہونا جس کا نتیجہ عملی امتیاز ہوتا ہے اس لئے آیت

مذکورہ سے وصف (ج) واضح طور پر ثابت ہو گیا اور یہی مضمون آیتِ ذیل سے بھی ثابت ہے۔

آیت (۲۹): وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ

(۲۴:۳۲)

ترجمہ: اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں سے بہت سے مقتدا بنا دیئے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے، جب کہ وہ لوگ صبر کیے رہے اور ہماری آیتوں کا یقین رکھتے تھے۔

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ ایمان میں صبر کا وہ درجہ ہے جو درجہ سر کا باقی بدن کے مقابلہ میں ہے اور اس پر استدلال میں یہ آیت پڑھی، پھر فرمایا

لما اخذوا برأس الامر صاروا رؤسا قال بعض العلماء بالصبر و اليقين تنال الامامة فى الدين.

ترجمہ: ان لوگوں نے جب راس الامر (صبر) کو اختیار کر لیا تو رؤسا اور مقتدا بن گئے اور بعض علماء نے فرمایا کہ صبر و یقین ہی کے ذریعہ دین کی امامت ہو سکتی ہے۔

(ابن کثیر ص ۴۶۳ ج ۳)

صبر عملی قوت کا اعلیٰ مقام ہے اور یقین علمی قوت کا اعلیٰ درجہ ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ قوم کا مقتدا اور پیشوا بننے کے لئے یہ دو وصف ہونے چاہئیں۔

اس لئے آیت مذکورہ سے وصف (ج) واضح طور پر ثابت ہو گیا۔

آیات ۲ مذکور الصدر میں حکومت کا مقصد دفعِ فتنہ و فساد قرار دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ جس شخص میں اس کی اہلیت و صلاحیت نہ ہو اس کو صدرِ مملکت بنانا بیکار ہے اس لئے اس سے اوصافِ امیر میں سے وصف (د) ثابت ہو گیا۔

یہ قرآن کریم کی چند آیات ہیں جو مختصر وقت اور معمولی غور و فکر سے دستوری مسائل پر مشتمل نظر آئیں، ان میں بھی دستورِ مملکت کی اہم دفعات تقریباً آ گئی ہیں، پورا غور اور مکمل تحقیق کی جائے بہت ممکن ہے کہ باقی دستوری مسائل بھی قرآنِ کریم سے ثابت ہوں۔

اور اصل یہ ہے کہ تمام اسلامی احکام، دستور، قانون میں قرآنِ کریم ایک اشارہ کرتا ہے

اوراس کی تشریح وتبیین رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قول وفعل سے فرماتے ہیں، اس لئے مکمل دستورِ اسلامی وہی ہوسکتا ہے جو قرآنِ کریم کی آیات اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے تعامل سے ثابت شدہ اصول پر مبنی ہو۔

مگر اس وقت پیشِ نظر تدوینِ دستور نہیں بلکہ درسِ قرآن کے سلسلہ میں ایک خاص مضمون کی آیات کی یکجا تفسیر کرنا ہے تاکہ قرآن کو سرسری طور پر پڑھنے والے مسلمان دیکھ لیں کہ براہِ راست قرآن مجید سے کس قدر اہم دفعاتِ دستور ثابت ہیں اور دستور ساز اسمبلی کے وہ ممبران جو علماء کی دستوری تجاویز کو محض ملاؤں کے قیاسات سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہتے ہیں قرآنِ کریم کے ارشادات پر مطلع ہوکر دنیا وآخرت کی ذمہ داری محسوس کریں،

واللہ الموفق والمعین

تشریحات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مختصر وقت، ہجومِ مشاغل سے پریشان دماغ اور ناتمام غور وفکر کے ساتھ جو آیاتِ قرآنی دستوری مسائل پر مشتمل نظر آئیں' ان کا ایک اجمالی خاکہ اور ان سے نکلنے والی دفعاتِ دستورِ مملکت آپ کے سامنے آچکی ہیں، ان دفعات میں کچھ دفعات تو ایسی ہیں جو عموماً ہر ملک کے دستور میں ہوا کرتی ہیں، ان میں تو نظامِ اسلام کا امتیاز صرف دستوری دفعات سے نہیں بلکہ عمل کے میدان میں نظر آتا ہے کہ اسلام اپنی دستور میں جو ذمہ داری لیتا ہے اس کو عملی طور پر پورا کرنے کا انتظام کیسا کرتا ہے اور کچھ دفعات ایسی ہیں جو دستوری حیثیت سے نظامِ اسلامی کا طغرائی امتیاز ہیں اور ذرا غور کرنیوالے کو اس کا اقرار کرنے سے چارہ نہیں رہ سکتا کہ دنیا کے امن وامان اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے صرف وہی پناہ گاہ ہوسکتی ہیں اور آج کی دنیا اور ان کے مختلف نظاموں میں جو شر وفساد اور کمی وکوتاہی ہے وہ انہیں اصولِ اسلامی کے نظر انداز کردینے سے ہے، ان کو آج بھی جو مملکت اپنالے گی وہ دنیا کے موجودہ نظاموں میں اپنی برتری کا جھنڈا گاڑ دے گی۔

پھر ان اصول کو اختیار کرنا عملی طور پر کچھ مشکل نہیں، ضرورت صرف اس کی ہے کہ کرنے والے کا ذہن چلے ہوئے رسم ورواج کا قیدی اور ان کے زہریلے اثرات سے مسموم نہ ہو، اس میں ذرا عزم وہمت اور حوصلہ بلند ہو، کسی قوم کی نقالی کا خوگر نہ ہو،

مذکور الصدر (۱۸) دفعات میں دفعہ ۱،۲،۳،۷،۹،۱۰،۱۲،۱۶،۱۷ انہیں دفعات سے ہیں جو نظامِ اسلامی کی خصوصیات اور امتیازی کارناموں میں داخل ہیں اور ان پر عمل کیا جائے تو دنیا کے نظام میں ایک بہترین انقلاب آسکتا ہے اس لئے ان کی کچھ تھوڑی سی مزید

تشریح ضروری ہے۔

دفعہ ۱، ۲، ۳، میں اس کا اقرار کیا گیا ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے قانون سازی کا اصلی حق اسی کا ہے، انسان صرف اس کا نائب امین ہونے ہی کی حیثیت سے حکمرانی کرسکتا ہے، انسانی قانون سازی کا دائرۂ عمل صرف وہ مباحات ہوں گے جن میں اللہ تعالیٰ نے بلاواسطہ یا بواسطہ رسول ﷺ خود کوئی قانون نہیں بنادیا۔

دستور اسلامی کی یہ ہر دو دفعات اہم انقلابی دفعات ہیں جو دنیا کو دین، سلطنت کو عبادت، سارے دفتری کاموں کو حسنات بنادینے والی ہیں، یہ مادی حکومت کو روحانی، سلطنت بشریہ کو حکومت الٰہیہ کا پیکر دیدیتی ہیں، ایسی حکومت کے زیرسایہ پرورش پانے والا معاشرہ صرف قانونِ حکومت کے خوف سے نہیں، بلکہ خدا کے خوف سے کام کرتا ہے، اس کی خلوت و جلوت یکساں ہوتی ہے، اس کے اخلاق پاکیزہ اور حوصلہ بلند ہوتا ہے، اس کا دستور وقانون ان کمزوریوں سے پاک ہوتا ہے جو ہر انسان میں قومی، نسلی، لونی، جغرافیائی بنیادوں پر کچھ نہ کچھ ہوا کرتی ہیں وہ پارٹیوں کی حکومت کی طرح روز روز کے انقلاب اور اس کی وجہ سے مملکت کی ترقیاتی اسکیموں کی ابتری سے محفوظ ہوتی ہے، کیونکہ اس کا دستور ناقابل تغیر اور اصول قانون جو قرآن وحدیث سے ثابت ہوں ناقابلِ ترمیم ہوتے ہیں۔

دفعہ (۷) میں امورِ ذیل قابلِ غور ہیں۔

(الف) حکومت کے تمام اموال وخزائن اور عہدے اور مناصب سب کو امانتیں قرار دیا گیا ہے اور عوام کو ان کا مالک و مستحق۔

(ب) پھر حکومت پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ ہر امانت کے مستحق کو کام کی قابلیت اور دیانت کے معیار سے پہچانے، قرآن کی آیت ان خیر من استأجرت القوی الامین میں اس معیارِ اہلیت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

(ج) اور پھر ہر مستحق کو اس کا حق (امانت) خود پہنچائے۔

آجکل عہدوں کے حصول میں جو ریس کا میدان گرم ہوتا ہے، زور وزر کی نمائش، ناجائز

سفارشات کا دباؤ، جھوٹ فریب کے جو جو کھیل کھیلے جاتے ہیں وہ کسی اہل بصیرت پر مخفی نہیں، ایک خالی عہدے کا اعلان ہوتا ہے تو ہزاروں درخواستیں دفتر میں پہنچتی ہیں اور ان کے ساتھ ہزاروں سفارشیں چلتی ہیں، دور دور کے تعلق سے رشوتوں کے دروازے کھلتے ہیں، جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قابل اور شریف آدمی کیلئے اس میدان میں قدم رکھنا ناممکن بن جاتا ہے۔

پورے ملک میں سے عہدوں پر عموماً وہ خودغرض نفس پرست لوگ پہنچتے ہیں جو علمی، عملی اور خصوصاً اخلاقی صلاحیتوں سے قطعاً محروم ہوں، اپنی ذلیل اغراض کے لئے پورے ملک و ملت کو قربان کردینا ان کا پیشہ ہو، خلق خدا کی پریشانی ان کے دلوں پر مطلق اثر انداز نہ ہو، وہ چھاؤں میں پنکھے کے نیچے بیٹھے ہوتے ہیں اور اہلِ معاملہ دھوپ میں کھڑے نظرِ التفات کے منتظر رہتے ہیں اور ذرا سے کام کیلئے مہینوں دفتروں کے چکر لگانا ان کا معمول ہوجاتا ہے اور جس کشتی کے ناخدا ایسے ہوں اس کا انجام معلوم اور یہ سب اس کا نتیجہ ہے کہ نہ ان چیزوں کو افسرانِ حکومت کوئی امانت سمجھتے ہیں، نہ اداءِ امانت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں بلکہ ہزار جدوجہد کے بعد جس کو کوئی چیز دیدیں تو ایک بخشش اور احسان سمجھا جاتا ہے، یہ سارا عذاب اسی اسلامی اصول کے نظرانداز کردینے کا نتیجہ ہے۔

اگر حکومت اسلامی اصول کے مطابق قابلیت اور دیانت کے معیار سے عہدوں کے اہل کی تلاش وتفتیش اور اہل کو عہدہ سپرد کرنے کا اہتمام خود کرے، عہدوں کی طلب کو ممنوع قرار دے، اسی طرح فقراء ومہاجرین میں تقسیم زمین واموال کیلئے درخواستوں اور مطالبوں کی راہ بند کرکے متعلقہ افسروں کو ہدایت ہو کہ مہاجرین کی ہر بستی میں پہنچ کر ان کے حالات کا معائنہ کرکے حسبِ حال ان کی امداد کی جائے تو مظلوم انسانیت ان بلاؤں سے یکسر نجات پاسکتی ہے جن سے ہزار کوششوں کے باوجود آج نجات مشکل ہورہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت میں یہی طرز رائج تھا، یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظمؓ راتوں کو مدینہ کی گلیوں میں پھرنے اور لوگوں کے حالات وحاجات کا بچشمِ خود معائنہ فرما کر اہل حاجات کی حاجت برداری کی خود فکر فرماتے تھے اور جہاں کہیں کسی

حاجت مند کی حاجت برآری میں دیر ہوئی تو اس کو اپنا قصور و گناہ تصور کرتے اور اس کے تدارک کی فکر کرتے تھے۔

منجملہ بہت سے وقائع کے ایک واقعہ آپ کا مشہور ہے کہ رات کے گشت میں ایک عورت اور اس کے بچوں کو بھوکا پایا، ماں نے بچوں کو بہلانے کے لئے چولھے پر پانی رکھ دیا تھا کہ کھانا پک رہا ہے، فاروق اعظمؓ نے یہ حال دیکھا تو اسی وقت بیت المال میں واپس آئے اور اشیاء خوردنی کی ایک گٹھری باندھ کر اپنے کاندھے پر رکھی، خادم نے لینا چاہا تو فرمایا کہ غفلت عمر کی ہے، عمر ہی اس کا بوجھ اٹھائیگا اور عورت کے مکان پر پہنچ کر دیدینے پر قناعت نہیں کی، خود کھانا پکا کر جب بچوں کو کھلا دیا اور وہ ہنسنے کھیلنے لگے اس وقت واپس آئے۔

بلادِ فارس فتح ہونے کے وقت ایک مرتبہ مالِ غنیمت لایا گیا اور مسجدِ نبوی میں سونے چاندی اور جواہرات کا ڈھیر لگ گیا، فاروق اعظمؓ نے حاضرین کو خطاب کر کے فرمایا کہ یہ اللہ کا مال ہے اور آپ ہی لوگوں کے لئے ہے جس کو جتنی ضرورت ہو بتلا کر لے لے۔

آپ غور فرمائیں کہ سونے چاندی کے خزانے سامنے پڑے ہیں، کسی دفتر میں درخواست لیجانے اور منظور کرانے کا سوال نہیں، کسی بنک سے نقد کرانے کا بھی انتظار نہیں، آخری اختیار رکھنے والا امیر اعلانِ عام کر رہا ہے اور جن کو خطاب ہے وہ کوئی مالدار اغنیاء نہیں، عموماً تنگ حال لوگوں کا مجمع ہے مگر اسلامی اصول اور ان پر عمل نے ایسا پاکباز، باعزت وخوددار معاشرہ پیدا کر دیا تھا کہ پورے مجمع میں سے کوئی لینے کے لئے نہ اٹھا، فاروق اعظمؓ نے دوبارہ اعلان کیا، پھر بھی سناٹا رہا، تیسری مرتبہ کے اعلان پر ایک نوجوان کھڑا ہوا اور عرض کی کہ اے امیر المومنین! کیا آپ ہمیں رسوا کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم اپنے حالات وحاجات مجمع کے سامنے پیش کریں، اگر یہ ہمارا حق ہے تو اصحابِ حقوق کا حق ان کو پہنچانا، ان کی حاجات و ضروریات کا اندازہ کرنا خود آپ کا فرض ہے، فاروق اعظمؓ نے اس کو تسلیم فرمایا اور تمام مہاجرین وانصار کی فہرست تیار کرا کے ہر ایک خاندان کو اس کی حاجات اور مسلمانوں کی قومی و ملی خدمات میں ان کی کارگذاری کے معیار سے اس کے گھر حصہ پہنچانے کا معمول بنالیا۔

(کنز العمال)

یہی وہ اکسیر تھی جس نے انسان کو فرشتوں کی صف میں بٹھا دیا تھا اور معاشرہ کو ایسا پاکباز بنا دیا تھا کہ باہمی نزاعات اور غصبِ حقوق کی جگہ ایثار و ہمدردی نے لے لی تھی اور آج بھی اگر دنیا کی قسمت میں امن وچین پھر مقدر ہے تو اسی امانت شناسی اور ادائے امانت ہی کے اصول کے تحت میں ہوسکتی ہے، حضرت امام مالکؒ نے خوب فرمایا ہے **لن یصلح اخر ھذہ الامۃ الا ما صلح بہ اولھا**، یعنی اس امت کے آخری دور کی اصلاح صرف وہی اصول کر سکیں گے جن سے امت کے ابتدائی دور کی اصلاح ہوئی تھی۔

آج حقوق طلبی کے دور میں کوئی ذمہ دار افسر کسی مہذب سے مہذب اغنیاء کے مجمع میں ایسا اعلان کر کے تو دیکھے، کتنے آدمیوں کا خون ہو جائے گا اور کس طرح سارا خزانہ لٹ جائے گا۔

یہ برکت اسی اسلامی اصول کی تھی کہ عوام میں عزتِ نفس کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی، ان کی درخواستیں لے کر دفتروں میں یا ووٹ حاصل کرنے کیلئے گلی کوچوں میں مارے پھرنے کی ذلت میں مبتلا نہیں کیا جاتا تھا۔

آج حقوق طلبی کی ماری ہوئی مظلوم انسانیت تو عزت وذلت کا مفہوم بھی بھول گئی، ان کا یہ احساس بھی باطل ہوگیا کہ درخواستیں لئے پھرنا کوئی ذلت ہے یا ووٹ حاصل کرنے کے لئے لوگوں کی خوشامد عزتِ نفس کے خلاف ہے وہ اس ذلت ہی کو عزت سمجھنے پر مجبور کر دیئے گئے۔

منتشر رہنے میں پانے لگی آرام حواس　　　شوق مجموعہ ہوش خرد افزانہ رہا

جب یہ اسلامی اصول دنیا میں رائج تھا کہ عہدوں کے خواہشمندوں اور طلبگاروں کو عہدہ نہ دیا جائے بلکہ خود حکومت مستحقین کو عہدے پیش کرے تو عہدے اور منصب خود ان کے دروازوں پر جاتے تھے اور ان میں جو لوگ زیادہ تقویٰ اور شعارِ زاہدانہ زندگی کے عادی تھے وہ ان سے بھاگتے تھے۔

امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے زمانہ میں ایک عہدۂ قضا خالی ہوا، امیر وقت نے بجا طور پر تین بزرگوں کا اس کے لئے انتخاب کیا امام اعظم، سفیان ثوری، شریک، امامِ اعظم نے قسم کھالی کہ

میں اس عہدہ کا اہل نہیں، ان سے کہا گیا کہ آپ آدھی دنیا کے امام مانے جاتے ہیں، یہ کیسے قبول کیا جاسکتا ہے کہ آپ اس کے اہل نہیں، تو فرمایا کہ میری اس قسم کو اگر آپ جھوٹی قسم سمجھتے ہیں تو آپ کے ہی معیار کے مطابق جھوٹا آدمی قاضی بننے کا اہل نہیں، وہ عاجز ہوئے تو امام صاحب کو قید کردیا، کوڑے لگائے گئے، امام صاحب نے ان مصائب کو برداشت فرمایا مگر عہدۂ قضا کی دینوی واخروی ذمہ داری کو اپنے سر لینا گوارا نہ کیا، سفیان ثوریؒ سے کہا گیا تو وہ روپوش ہوکر بھاگے اور دریائے دجلہ کے کنارہ پر ایک کشتی والے سے کہا کہ لوگ مجھے ذبح کرنا چاہتے ہیں مجھے اپنی کشتی میں بٹھا کر دریا پار کرادو (ذبح کرنے سے اشارہ اس حدیث کی طرف تھا جس میں فرمایا گیا کہ جو شخص قاضی بن گیا وہ گویا بلا چھری ذبح کردیا گیا) اب شریک رہ گئے وہ اس عہدہ کو قبول کرنے پر مجبور کردیئے گئے، اس پر اس زمانہ کے لوگوں نے انہیں مطعون کیا۔

اور حقیقت یہی ہے کہ اگر ان عہدوں اور ممبریوں کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے کہ وہ کوئی پھولوں کی سیج، عیش وعشرت کا سامان نہیں' ایک بھاری ذمہ داری، خالق اور خلق کے سامنے مسئولیت کا بار اور محنت طلب امانت ہے تو طبعی اور عقلی طور پر ان عہدوں' ممبریوں کی تقسیم میں یہ صورت پیش آنا ناگزیر ہے کہ عہدے لوگوں کے دروازے پر آئیں اور وہ ان سے بھاگتے پھریں۔

یہاں یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ صورت ان قرونِ خیر اور پاکباز حضرات کے زمانہ میں چل گئی، آج چودھویں صدی میں جب کہ انسانی ہمدردی، ایثار، مروت، اخلاق فاضلہ کا گویا دنیا سے بیج ہی سوخت ہوگیا، ہر طرف خویش پروری، پارٹی نوازی، خودغرضی کا دور دورہ ہے، اس وقت اگر ان تمام چیزوں کا مکمل اختیار صرف حکام اور متعلقہ افسروں کے سپرد کردیا جائے تو وہ سارے عہدے اور دوسری امانتیں اپنے اقرباء واحباب میں بانٹ دیں گے، عوام محروم رہ جائیں گے، اسی لئے آج کل عہدوں کے پر کرنے کے لئے صرف حکام کو مختارِ کل نہیں بناتے بلکہ اس کے لئے ایک پبلک سروس کمیشن بٹھایا جاتا ہے، وہ تمام درخواست دہندگان کی تعلیمی ڈگریاں دیکھ کر اور ان سے ملاقات کرکے مختلف سوالات کے ذریعہ ان کی قابلیت کو جانچنے کے بعد اپنی رپورٹ حکام کو پیش کرتا ہے، حکام اس پر عمل کرنے کے پابند ہیں، اس طرح عہدے

نااہلوں کے تسلط سے بچ سکتے ہیں، لیکن جو لوگ دنیا کو محض کاغذات اور رجسٹروں میں نہیں بلکہ عمل کے میدان میں دیکھتے ہیں ان پر یہ بات مخفی نہیں کہ معاشرہ کی خودغرضی، بداخلاقی کا ان تمام ہتھکنڈوں سے کوئی مداوا نہیں ہوتا، ضابطہ قانون دفتروں اور رجسٹروں کے ان چکروں سے خلقِ خدا پر مشقت تو بڑھ جاتی ہے مگر خویش پرور اقربا نواز افسروں کی ناجائز تصرفات پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، جاننے والے جانتے ہیں کہ بہت سے عہدے خالی ہونے سے پہلے ذہنوں میں پُر ہوچکے ہوتے ہیں، بعض اوقات ان کو خالی ہی کسی منظورِ نظر کے لئے کرایا جاتا ہے، اخباروں کے اعلانات، پبلک سروس کمیشن کا انٹرویو سب نمائشی ضابطہ پری کے لئے کئے جاتے ہیں۔ مصیبت زدہ طلبگارانِ عہدہ دور دور سے سفر کرکے آتے ہیں اور انٹرویو سے امیدیں لگا کر دفتروں کے چکر کھاتے ہیں، ان غریبوں کو خبر نہیں ہوتی کہ وہاں عہدہ پر نامزدگی بھی ہوچکی ہے۔

علاوہ ازیں جہاں حکام اور افسروں پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ خود مستحقین کو تلاش کرکے عہدے ان کے سپرد کریں، وہیں ان افسروں کا تقرر دیانت وامانت کی شرط سے کیا جائے گا اور پھر بھی ان کو آزاد نہیں چھوڑا جائے گا کہ جو چاہیں کریں' بلکہ ان کو یہ ہدایت دی جائے گی کہ اپنی ولایت میں کسی اہل کے ہوتے ہوئے کسی نااہل کو عہدہ سپرد کیا گیا تو وہ خائن سمجھے جائیں گے، حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی کو کوئی عہد سپرد کیا حالانکہ اسے معلوم ہے کہ اس کی ولایت میں اس سے زیادہ اہل ومستحق افراد موجود ہیں تو اس نے اللہ ورسول کی بھی خیانت کی اور تمام مسلمانوں کی بھی (ہدایہ) اور ظاہر ہے کہ خائن افسر معزول کرنے کا مستحق ہے، ایسے افسر پر افسرانِ بالا کی نگرانی بھی ہوگی اور عوام کے لئے بھی شکایات کے دروازے کھلے ہوں گے، خصوصاً نظامِ اسلامی کے رواج کی صورت میں جس میں حکام کے دروازہ پر پہرہ کی چوکی کا اصول نہیں۔

اصل چیز یہ ہے جب تک معاشرے کی اخلاقی اصلاح نہ ہو اور عہدوں، منصبوں پر تقرر اور ترقیات کے لئے مدار کار قابلیت کے ساتھ دیانت داری کو نہ بنایا جائے اور تعلیم گاہوں سے لے کر وزارتی اداروں تک ہر شخص کے اخلاق، کیریکٹر، دیانت داری، خدا ترسی کو ہر قدم پر

قابلیتوں سے زیادہ بنیادی اساسِ قبولیت وترقیات نہ ٹھیرایا جائے ان بیماریوں کا علاج نہ کسی دستور سے ہوسکتا ہے نہ کسی قانون سے۔

آج انٹرویو کے وقت امیدواروں سے طرح طرح کے بے تعلق سوالات کئے جاتے ہیں اور بعض جگہ یہ سوال بھی کئے جاتے ہیں کہ اس کی بیوی حسین بھی ہے یا نہیں اور وہ بے پردہ ہے یا نہیں؟ لیکن کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ جس کو ہم بڑے سے بڑا عہدہ سپرد کررہے ہیں اس کے اخلاق کیسے ہیں، خلق خدا کے ساتھ اس کا برتاؤ کیا ہے، اس کی دیانت داری کا کیا حال ہے، خدا اور آخرت کا کچھ خوف بھی اس کے دل میں ہے یا نہیں؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج حکومت رشوت ستانی کے انسداد کے لئے قانون بناتی ہے، کمیشن مقرر کرتی ہے مگر ان سب عہدوں پر بھی اسی ٹھپہ کے لوگ آتے ہیں اور پہلے اگر رشوت کھانیوالے دس تھے تو اب پندرہ ہوجاتے ہیں، رشوت دینے والوں کی جیبوں پر اور نیا بار پڑجاتا ہے، مہاجرین کی آبادکاری کے لئے باقاعدہ وزارت بنتی ہے، اس کے ماتحت ہزاروں آدمیوں کے عملے کام کرتے ہیں، مگر پانچ یا چھ سال گزرنے کے بعد بھی غریب مہاجرین بجز تعداد قلیل کے وہیں نظر آتے ہیں جہاں تھے۔

اس کے خلاف نظام اسلام کا طغرائی امتیاز یہی ہے کہ کام کی قابلیت کے برابر ہے یا اس سے بھی زیادہ عہدہ دار کی دیانت وامانت وخداترسی کو دیکھا جاتا ہے، قرآنِ کریم نے عہدوں اور ممبریوں اور تمام کاموں کو کسی کے سپرد کرنے کے وقت اہلیت معلوم کرنے کے لئے صرف دولفظوں میں ایسا پاکیزہ ضابطہ بیان فرمادیا ہے جو نظامِ عالم کی صلاح کا کفیل ہے إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ لفظ قوی سے کام کی قابلیت اور امین سے امانت داری کا وصف مراد ہے اور ان دونوں وصفوں کی تحقیق ہر شخص کی زندگی کے سابقہ حالات سے بآسانی ہوسکتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب دیانتدار افسر ہوں تو ذمہ داری ان کو سپرد کرنا موجبِ برکات وخیرات ہی ہوگا، شبہ کرنے والوں کے سامنے اپنے موجودہ افسر ہیں جن کو بے دینی وناخداترسی گھٹی میں پلائی گئی ہے۔

فاروقِ اعظمؓ نے ایک صاحب کو کسی صوبہ کا عامل (گورنر) بناکر روانہ کرنے کا فیصلہ کیا،

اور فرمان لکھ کر ان کے سپرد کیا، روانگی کے وقت تعظیماً کچھ دور تک پہنچانے کے لئے ساتھ چلے، راستہ میں کسی غریب مسلمان کا میلا کچیلا بچہ کھیل رہا تھا، فاروق اعظمؓ نے اس کو گود میں اٹھا کر اس کے ساتھ بچوں کی زبان میں باتیں شروع کیں، تو یہ صاحب جن کو گورنری پر بھیجا جارہا تھا ایک حیرت واستعجاب کی نظر سے دیکھنے لگے، فاروق اعظمؓ نے بھانپ لیا پوچھا کہ تم اس طرح کیوں دیکھتے ہو، انھوں نے کہا کہ آپ کا یہ عمل تو ایک امیر المومنین کے شایانِ شان نہیں، میں تو بخدا اپنے بچہ کے ساتھ بھی یہ برتاؤ نہیں کرتا۔

فاروق اعظمؓ نے محسوس کیا کہ ان میں خلق خدا پر رحمت وشفقت کا مادہ نہیں، فوراً گورنری کا فرمان ان کے ہاتھ سے لے کر چاک کردیا اور فرمایا کہ ’’جس شخص کو اس معصوم مخلوق پر بھی شفقت کا جذبہ نہیں تو ساری مخلوقِ خدا کی گردنوں پر اس کو کیسے مسلط کردوں‘‘

شمس الائمہ سرخسیؒ نے مبسوط کتاب القضاء میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے

فيه دليل على ان الامام اذا ارادان يقلد الانسان القضأ ينبغى له ان يجربه فان رسول الله صلى الله عليه وسلم لما فعل ذلک بمعاذمع انه كان معصوماً فغيره بذلک اولى فكان هذا منه على وجه التعليم لا متة

(مبسوط ص ۷۰ ج ۱۶)

اس جگہ یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ سب چیزیں اس زمانہ میں اس لئے چل گئیں کہ معاشرہ ہی تربیت یافتہ، امانت ودیانت کا پیکر تھا، آج ایسے آدمی کہاں سے لائیں۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں تو عام معاشرہ کا حال اب سے زیادہ گندا اور خراب تھا، ظلم وجور، قتل وغارت، بے حیائی اور فحاشی عام تھی، نظامِ اسلام کے اختیار کرنے ہی کی یہ برکات تھیں کہ معاشرہ کی اصلاح اس درجہ میں پہنچ گئی، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اس بگڑی ہوئی حالت کو دیکھ کر ہماری طرح یہی سوچتے کہ اس فضاء میں یہ نظامِ اسلامی جاری نہیں ہوسکتا تو نظامِ سلطنت کیا صرف کلمۂ اسلام کا پھیلانا بھی ممکن نہ ہوتا۔

آج بھی انہیں خطوط پر نظامِ حکمرانی کا مدار رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ معاشرہ کی اصلاح نہ ہو اور دیانت دار آدمی نہ ملیں، نظامِ اسلامی خود ایک کیمیاء ہے جو بروں کو بھلا، غنڈوں کو متقی بنا دیتا ہے، ہاں یہ کیسی طرح ممکن نہیں کہ حکومت کے تمام کاروبار تو عریانی، فحاشی، بدمعاشی، رشوت، جھوٹ کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں اور بڑے سے بڑا عہدہ و اعزاز بڑے سے بڑے بدمعاش، فحاش کو ملتا رہے اور پھر بھی معاشرہ میں غلبہ دیانت و امانت کا رہے،

نظام اور طریقۂ کار کا رخ ذرا اسلام کی طرف بدل کر دیکھئے کہ لوگ کس طرح جوق در جوق اسلامی اخلاق و کردار کی طرف آتے ہیں اور نصرتِ خداوندی کس طرح معاشرہ کا رخ اصلاح کی طرف پھیر دیتی ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی امداد کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور میدان بدر و حنین ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ قرآنی اعلان کے مطابق وہ صرف صبر و تقویٰ کے دو اصول پر مبنی تھی، آج بھی کسی قوم میں یہ وصف پائے جائیں تو خدا تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی امداد ہر وقت موجود نظر آئے گی

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

مصیبت یہ ہے کہ جو رسوم کسی ملک یا قوم میں رائج ہو جاتی ہیں ان کی خرابیاں واضح ہوتے ہوئے اور اس کے مقابل دوسرے طریقوں کا نافع و مفید ہونا معلوم ہوتے ہوئے رسومِ مروجہ کی قیود سے نکلنا بڑی مردانگی کا کام ہے، ہر شخص کے بس کا نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی جس طرح مذہبی رسوم میں شرک و کفر داخل ہو گیا تھا، اسی طرح اجتماعی نظموں اور ہر سیاسی کاروبار میں ظلم و جور، خودغرضی و ناحق شناسی کا دور دورہ تھا، یہی ان کی مروجہ رسوم تھیں جن کو اپنا آبائی دین سمجھ کر قرآن کے مقابلہ میں آتے اور کہتے تھے کہ ہم اپنے آبائی رسوم کو نہیں چھوڑ سکتے، **مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۖ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ** (۳۸:۷)۔

اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں جہاں دین و دنیا کے اہم اصول اور ابواب کو بیان فرمایا وہیں یہ بھی ارشاد ہوا کہ

رسوم الجاهلية موضوعة تحت قدمي هاتين، ''زمانہ جاہلیت کی سب رسومِ

مروجہ آج میرے قدموں کے نیچے روند دی گئی ہیں، اس طرح مخلوقِ خدا کو جاہلانہ رسوم سے نجات دلا کر صحیح راستہ پر ڈالا۔

آج بھی ہمارے روشن خیال حضرات یورپ کی مروّجہ رسوم سے بے طرح اور بلا وجہ مرعوب ہیں، انھوں نے ایسے رسوم و اصول اختیار کئے جو خلقِ خدا کے لئے نہایت مضر اور خدا کی زمین پر فساد پھیلانے والے ہیں لیکن وہ چونکہ آج ایک فاتح قوم کی حیثیت رکھتے ہیں، اپنی بری سے بری چیز کو بڑے حوصلہ اور عزم سے دنیا کے سامنے پیش کرتے اور منوا لیتے ہیں، اس کے خلاف ہمارے یہ بھائی احساسِ کمتری کا شکار اور ان سے اتنے مرعوب و مغلوب ہیں کہ اپنی بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ چیز کو ان کے سامنے پیش کرتے ہوئے گھبراتے ہیں کہ کہیں یہ لوگ دقیانوسی یا رجعت پسند نہ کہدیں، لیکن ایک صاحبِ عزم کے لئے ایسے مواقع پر اکبر مرحوم کی یہ نصیحت کافی ہے۔

بیوفا سمجھیں تمہیں اہل حرم اس سے بچو
دیر والے کج ادا کہدیں یہ بدنامی بھلی

دفعہ (۹) متعلقہ کورٹ فیس

دفعہ (۹) میں انصاف کا مفت بلافیس ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے، افسوس ہے کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں انصاف کی بھی تجارت ہوتی ہے، انصاف پر کورٹ فیس اور اسٹامپ اور طرح طرح کے خرچے ڈال کر فروخت کیا جاتا ہے اور وہ بھی اتنا گراں کہ غریب آدمی کو ظلم پر صبر کر لینا اتنا مشکل نہیں جتنا اس انصاف کا حاصل کرنا دشوار ہے، حکومت عوام سے جو زمینوں کے ٹیکس وغیرہ وصول کرتی ہے ان کا سب سے پہلا مصرف عدل و انصاف کا قائم کرنا ہے، انصاف اس کے فرائضِ منصبی میں داخل ہے، اس پر کوئی مزید معاوضہ طلب کرنا ظلم و ستم اور ایک ذلیل قسم کی تجارت ہے، جس کو کوئی سلیم الطبع انسان گوارا نہیں کر سکتا، مگر یورپ کے بنیوں نے جو رسم جاری کر دی، یورپ کی چمک دمک سے مرعوب دماغوں کو اس کی برائی کا کوئی احساس نہیں ہوتا، انا للہ،

دفعہ (۱۰) متعلقہ سیفٹی ایکٹ

دفعہ (۱۰) میں اسلام کا یہ اصول واضح کر دیا گیا ہے کہ بدون ثبوتِ جرم کسی شخص کو سزا نہیں دی جاسکتی تا کہ اربابِ اقتدار بھی قانون کے پابند ہیں، اپنی اغراض ومصالح کی بنا پر کسی کو قید نہ کرسکیں، آج کی جمہوریت نواز دنیا میں ایک طرف عدل وانصاف اور مساوات کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے، بڑی کوشش سے قانون مدون کیے جاتے ہیں، دوسری طرف اس سارے قانون کے نیچے سیفٹی ایکٹ کی سرنگ بچھا دی جاتی ہے اور اختیار اربابِ اقتدار کے ہاتھ میں دیدیا جاتا ہے کہ جب چاہیں اس سارے قوانین کے جال کو ختم کردیں، نام ملکی مصالح کا لیا جاتا ہے اور اسکے اندر اربابِ انتظام کی ذاتی اغراض اور پارٹی سسٹم کام کرتا ہے، اسلامی جمہوریت میں ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے واپس لینے کی کوئی گنجائش نہیں، اسلئے سیفٹی ایکٹ کو عدل عمرانی کے منافی قرار دیا گیا ہے۔

دفعہ (۱۲) قومیتوں کی تقسیم وامتیاز

دفعہ (۱۲) معاشرت وسیاست کی ایک اہم اصول کی تعلیم ہے جس کو آج کی مادہ پرست دنیا نے یکسر بھلا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوسرے حیوانات سے اور پھر ایک انسان کو دوسرے انسان سے ممتاز کرنے کے لئے خود اس کی ذات میں پھر اس کے ماحول میں بہت سی چیزیں پیدا فرمادی ہیں تا کہ ایک انسان کے حقوق پر دوسرا قابض نہ ہوسکے، انسان کے اپنے بدن میں ہزاروں اشتراکات کے باوجود ایسے امتیازات ہیں جن کی بنا پر عربی رومی سے، رومی حبشی سے، حبشی ہندی سے ممتاز ہے اور پھر ہندی میں پنجابی بنگالی سے، بنگالی یوپی سے، سی پی والوں سے یوپی والے افغانی اور بلوچی سے خاص خاص امتیاز رکھتے اور علیحدہ پہچانے جاتے ہیں...... مگر یہ سارے امتیازات ایسے ہیں جو انسانوں کی طرح حیوانات میں بھی موجود ہیں، افریقہ کا گدھا ہندی گدھے سے ممتاز، عربی گھوڑا دوسرے گھوڑوں سے ممتاز، ایک خطہ کا بندر دوسرے خطہ کے بندروں سے جدا نظر آتا ہے، اس قسم کے امتیازات میں انسان کی کوئی خصوصیت نہیں بلکہ وہ امتیاز جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے وہ صرف نظریات واعتقاد کا امتیاز

ہے، کوئی خدا پرست ہے، کوئی بت پرست یا مادہ پرست...... اسلام نے پہلی قسم کے حیوانی صوبائی امتیازات کا رہن سہن اور معاشرت کے ابواب میں تو بقدرِ ضرورت اعتبار کیا ہے لیکن قومیتوں کی تفریق اور سیاسیات میں حقوق وفرائض اور عہدوں کی تقسیم میں اس کا قطعاً کوئی اعتبار نہیں کیا، بلکہ قرآن وحدیث کے کھلے کھلے ارشادات ان امتیازات کو مٹانے کے لئے آئے، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی عملی سیاست نے عربی وزنگی، ہندی ورومی، کالے اور گورے کو ایک کر کے دکھا دیا، ہاں فرق کیا تو اس امتیاز کی بنا پر کیا جو انسان کے لئے مخصوص ہے یعنی نظریات واعتقادات کا امتیاز، ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیا اور غیر مسلموں کو دوسری قوم، قرآن نے اس کا اعلان ان الفاظ میں فرمادیا **هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّ مِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ** یعنی اللہ نے تم سب کو پیدا فرمایا، پھر تم میں کچھ لوگ مومن ہو گئے کچھ کافر، کہیں ارشاد فرمایا **اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ** ، مسلمان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں...... اسلام میں حیوانی (یعنی صوبائی، لونی، لسانی) امتیازات کو سیاسی حقوق وفرائض میں نظر انداز کرنا اور نظریاتی امتیازات کا اعتبار کرنا ایک بڑی حکمت پر مبنی ہے کہ پہلی قسم کے امتیازات میں انسان کے اپنے اختیار کو کوئی دخل نہیں، ایک شخص کالا پیدا ہوگیا تو اس کا کوئی قصور نہیں، کوئی گورا پیدا ہوگیا تو اس کا کوئی اختیاری کمال نہیں، اسی طرح کوئی بنگال میں پیدا ہوگیا کوئی پنجاب میں اس میں پیدا ہونے والے کے عمل کا کوئی دخل نہیں، ان غیر اختیاری اوصاف پر اگر انسان کے حقوق وفرائض دائر کردیئے جائیں تو انسانیت پر ظلمِ عظیم ہے، ان چیزوں کی بناء پر جانوروں کے حقوق وفرائض میں تو امتیاز کیا جاسکتا ہے کہ افریقہ کے گدھے کی خوراک زیادہ ہے اس کو زیادہ دو یا فلاں خطہ کا بیل پانی زیادہ پیتا ہے اس کو پانی زیادہ پلاؤ، یا فلاں خطہ کا جانور بوجھ زیادہ اٹھالیتا ہے اس پر زیادہ بوجھ لادو، لیکن انسان کا امتیاز ان غیر اختیاری اوصاف کی بنیاد پر نہیں کیا جاسکتا، انسان کے حقوق وفرائض میں کمی بیشی اور امتیاز صرف انہیں اوصاف کی بناء پر ہوسکتا ہے جو انسان کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کے حاصل کرنے میں انسان کی سعی وعمل کو دخل ہے، اب جو شخص سعی وعمل میں کوتاہی کرتا ہے کرے وہ اپنے حقوق کی کمی کا خود ذمہ دار ہے،

آج کی مہذب کہلانے والی قوموں نے اس واضح حکمت کونظر انداز کر کے انسان کو جانوروں کے ساتھ ملادیاان کی قومیت کی تقسیم وطنی اور لسانی یارنگ وشکل کی بنیادوں پر کرڈالی جوان کے اختیار وعمل سے بالاتر ہے،اور جوسراسر ظلم ہےاقبال مرحوم نے خوب فرمایا ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

اورصرف یہی نہیں بلکہ جوامتیاز انسانی یعنی نظریاتی اوراختیاری امتیاز حقوق وفرائض کی کمی بیشی کامحور ہوناچاہئے تھااسی کوسب سے بڑاظلم قرار دیدیا،آج اپنی نفسانی اور حیوانی خواہشات اور پارٹی بندی کے جذبات کے ماتحت کتنے ہی جھگڑے فتنے اٹھائے جائیں اور امتیازات رکھے جائیں وہ سب روا ہیں،ان کو نہ رواداری کے خلاف سمجھا جاتا ہے نہ جمہوریت کے، گناہ عظیم صرف یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی وجہ سے کسی سے اختلاف کیا جائے اورکفر وسلام میں امتیاز کیا جائے، انا للہ ؎

خرد کا نام جنون رکھدیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

دفعہ(۱۶)،(۱۷) متعلقہ معاشی نظام

آج کل دساتیرِ عالم کا سب سے اہم باب معاشی نظام سے متعلق سمجھا جاتا ہےاوراس میں ہرملک، ہرخطہ، ہرسلطنت کاالگ الگ نظام ہے،اسلامی نظام اس معاملہ میں بھی افراط و تفریط کے درمیان معتدل فطری اصول پرمبنی ہے۔

ایک زمانہ میں بلاامتیاز حلال وحرام جس طرح ممکن ہومال ودولت کاجمع کرلینااورسرمایہ داری ہی سب سے بڑاہنرتھا،لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب عوام کو یہ نظر آیا کہ ملک کاایک مخصوص طبقہ تمام حقوقِ عامہ اوردولت کے اڈوں پرقابض ہوگیااورعوام کے لئے ذرائع معاش بجزان کی غلامی کے نہ رہے تواس کاردعمل شروع ہوا۔

اب وہ سرمایہ داری سے بھاگے تو اشتراکیت کے دامن میں پناہ لی جس نے سرے سے

انفرادی ملکیت ہی کوختم کرنے کابیڑااٹھالیااگرغفلت سے باز آیاجفاکی’’عرب کی مشہور مثال ہے’’الجاهل امامفرط او مفرط ‘‘جاہل ہرکام میں یاکوتاہی کاشکاررہتا ہے یاحدود سے آگےنکل جائے گا،درمیان میں نہیں رہتا۔

آج انسانی فطرت ان دونوں افراط وتفریط کی باہمی آویزش سے کچلی جارہی ہے،اسلام کاعادلانہ نظامِ محکم جس طرح پہلے دن سے امریکی طرز کی سرمایہ داری،سودخوری کے خلاف اعلانِ جنگ کررہاتھااسی طرح اس اشتراکی نظریہ کوانسانی فطرت اورعدل عمرانی کے خلاف قرار دیتاہے،اس نے دولت کے دوحصے کردیئے ہیں،ایک حصہ کوتمام انسانوں کامساوی حقوق قرار دے کراس پرکسی کامالکانہ قبضہ ناجائز قراردیدیااوروہ حکومت کی ذمہ داری میں دے دیا گیا تاکہ وہ اس کاایسانظم قائم کرے کہ ہرباشندۂ ملک اس سے فائدہ اٹھاسکےاورباشندگانِ ملک کی موجودہ اورآئندہ نسلوں کے لئے وہ باقی رہ سکے،مثلاًدریااوراس میں پیداہونے والی تمام چیزیں، پہاڑاوران میں پیداہونے والی تمام چیزیں،معادن،کانیں،قدرتی چشمےاورحکومت کے قبضہ میں آنے والی وہ تمام دولت جوبدون لشکرکشی حاصل ہوئی ہو،جس میں فوج کی کوئی محنت وسعی کودخل نہ ہواوردنیاکے جغرافیہ پرنظرڈالی جائے تودنیاکی سب سے بڑی دولت یہی ہے جواللہ نے وقفِ عام اورمشترک قراردیدی ہے،دفعہ ۱۶ کاتعلق اسی قسم کے مال ودولت سے ہے،اس کوشخصی ملکیتوں اورناجائزقبضوں سے بچاناحکومت کافرض ہے۔

دوسراحصہ وہ ہےجس میں انسانی سعی وعمل کودخل ہےاوراس کے ذریعہ وہ اس کی مخصوص ملکیت سمجھی جاتی ہے بشرطیکہ جائز طریقوں سے حاصل کی گئی ہو،اس میں تمام انسان مساوی نہیں ہوتے،بلکہ اپنے اپنے کسب وعمل کے تفادت سے متفاوت مراتب پرغنی وفقیرہوتے ہیں اوریہ تفاوت ہی انسان کوباہمی مسابقت پرآمادہ کرتاہے،اوردماغی اورعملی قوتوں کوبیدارکرتا ہے،اگراس میں تفاوت کومٹاکریکسانیت پیداکردی جائےتوکام کرنیوالوں کاعزم وہمت مردہ اورحوصلے پست ہوکرنظامِ عالم کی بربادی کاسامان ہوگا۔

جس حصے کوانفرادی ملکیت قراردیاہےاس کے متعلق اسلامی شریعت کانہایت موکدحکم ہے کہ اس ملکیت کااحترام کیاجائے،کسی کی مخصوص ملکیت بغیرشرعی حق کےاس کے قبضہ سے

نکالنا یا اس کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کرنا گناہِ عظیم قرار دیدیا گیا ہے، نہ عوام کو آپس میں اس کی اجازت ہوسکتی ہے کہ ایک دوسرے کی ملکیت پر قبضہ کرلیں یا بلا اجازت تصرف کریں نہ کسی حکومت کو اس کا حق ہے۔

دفعہ ۱۷ اس قسم کے اموال سے متعلق ہے جس میں شخصی اور انفرادی جائز ملکیتوں کی حفاظت حکومت کے فرائض میں داخل کی گئی ہے، البتہ حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ (الف) معاملات کی ایسی صورتوں کے رواج کو بند کرے جن کے ذریعہ دولت سمٹ کر خاص اغنیاء اور مالداروں کے قبضہ وملک میں نہ آجائے اور عوام محروم ہوجائیں۔

(ب) شخصی جائداد کو اگر مالک معطل کر کے ڈال دے نہ خود اس سے آمدنی حاصل کرے، نہ دوسروں کو کرنے دے، تو حکومت کو یہ بھی حق ہے کہ اس کو سرکاری نگرانی میں لے کر اس سے آمدنی پیدا کرنے کا انتظام کرے اور انتظامات کے اخراجات جائداد کی آمدنی سے وصول کر کے باقی آمدنی مالک کو ادا کرے تاکہ عوام کے حقوق جو اس کی پیداوار سے متعلق ہیں وہ بھی ضائع نہ ہوں اور مالک کا حقِ ملکیت بھی ادا ہوتا رہے۔

حقوق وفرائض

دنیا کے رائج الوقت دساتیر میں عموماً ایک باب بنیادی حقوق کا رکھا جاتا ہے، قرآنِ کریم نے سورۂ نساء کی دو آیات نمبر (۱۵،۱۱) میں اس طرز کو بدل کر پہلی آیت میں حکام اور اربابِ اقتدار کو اور دوسری میں عوام کو خطاب کر کے دونوں فریقوں کو اپنے اپنے فرائض بتلائے ہیں یعنی فریقین کے حقوق بیان کرنے کے بجائے دونوں کے فرائض بیان کر کے گویا بنیادی حقوق کے بجائے بنیادی فرائض کا باب قائم کردیا، جس سے حکومت کے لئے ایک اہم ہدایت نامہ حاصل ہوا کہ ہر فریق کو حقوق طلبی کے بجائے فرائض شناسی کی تلقین کی جائے کہ عام حقوق کی ادائیگی کا اس سے بہتر کوئی ضامن نہیں ہوسکتا، کیوں کہ عموماً ایک فریق کے حقوق دوسرے فریق کے فرائض ہوتے ہیں، اگر ہر فریق اپنے اپنے فرائض کی فکر میں لگ جائے تو سب کے

حقوق خود بخود ادا ہوجائیں، مثلاً والدین کا فرض ہے کہ نابالغ اولاد کی تربیت کریں، ان کے نفقہ، تعلیم، صحت، تہذیبِ اعمال واخلاق کا مقدور بھر پورا انتظام کریں، ان کے یہ فرائض ہی اولاد کے حقوق ہیں، اسی طرح اولاد کے فرائض ماں باپ کی اطاعت، خدمت وغیرہ ہیں' یہی ماں باپ کے حقوق ہیں اسی طرح شوہر کے فرائض بیوی کے حقوق اور بیوی کے فرائض شوہر کے حقوق ہوتے ہیں، اسی طرح عوام کے فرائض حکومت کے حقوق اور حکومت کے فرائض عوام کے حقوق ہوتے ہیں، اگر ان میں سے ہر فریق اپنے اپنے فرائض کو پہچاننے اور ان کو ادا کرنے کی فکر کرے تو حقوق طلبی کے وہ شور وہنگامے جو خانگی زندگی سے لے کر عالمی زندگی تک دنیا کو جنگ وجدال بلکہ قتل وقتال کا جہنم بنائے ہوئے ہیں یکسر ختم ہوجائیں اور ظلم وجور کے پنجہ میں پھنسی ہوئی مظلوم انسانیت آرام واطمینان کا سانس لے سکے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت اسی ہدایت نامہ کے ماتحت ہر جھگڑے کا ابتدائی فیصلہ اسی راہ سے کرنے پر غور کرتی تھی، کہ لوگوں کو اپنی حق تلفی کی فکر میں پڑنے کی بجائے فرض شناسی کی فکر میں لگا دیا جائے۔

ایک بیٹے نے باپ کی شکایت کی تو فرمایا **اطع اباک وان ظلمک** یعنی باپ اگر تم پر ظلم بھی کرے تو تم اپنے فرض اطاعت وخدمت کو نہ چھوڑو، کسی بیوی نے شوہر کی شکایت کی تو فرمایا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ عورتیں اپنے شوہروں کی شکایات لئے پھرا کریں، ایک شوہر نے بیوی کی شکایت کی تو فرمایا کہ عورت کے مزاج میں ایک گونہ کجی ضرور ہے، اس سے کام لینا ہے تو اس پر صبر کرنا پڑے گا اور اسی حالت میں اس کو فرائض ادا کرنے ہوں گے۔''

مسلمانوں سے صدقات، زکوٰۃ وغیرہ وصول کرنے والے عاملین کو جب اپنے اپنے علاقہ میں زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بڑی تاکیدی ہدایات دی جاتی تھیں کہ وہ کسی کو پریشان نہ کریں، کسی سے حق سے زائد وصول نہ کریں، خود ایک جگہ بیٹھ کر اصحابِ اموال کو اپنی جگہ آنے کی تکلیف نہ دیں' بلکہ خود ان کے گھروں پر جا کر حساب کے موافق ان سے صدقات وصول کریں' حدیث میں **لا جلب ولا**

جنب اورایاکم وکرائم اموالھم وغیرہ کے الفاظ انہی ہدایات پر مشتمل ہیں،ان کی خلاف ورزی کرنے والوں پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔

لیکن دوسری طرف ایک مرتبہ کچھ لوگ آتے ہیں اور صدقات وصول کرنے والوں کی شکایات کرتے ہیں کہ وہ ہم پر ظلم کرتے ہیں تو ان کو یہ ہدایت دی جاتی ہے **ارضوا مصدقیکم ولید عوالکم** یعنی اپنے عاملینِ صدقہ کو راضی کر کے واپس کردو کہ وہ تمہیں دعائیں دیتے ہوئے واپس ہوں،اس طرز عمل کا مبارک نتیجہ تھوڑے ہی عرصہ میں سامنے آ گیا کہ بجائے باہمی شکوہ شکایت کے یہ نوبت آنے لگی کہ ایک صاحب بکریوں کی زکوٰۃ میں ایک اعلیٰ درجہ کا بکرا پیش کرتے ہیں،وصول کنندۂ زکوٰۃ کہتا ہے کہ یہ تمہارے ذمہ واجب شدہ حق سے زیادہ مالیت کا ہے،اس سے کم درجہ کا بکرادو،وہ اصرار کرتا ہے کہ یہی دوں گا،عامل صدقہ کہتا ہے کہ میں یہ نہیں لے سکتا،اب دربارِ رسالت ﷺ میں جھگڑا اس صورت میں آتا ہے کہ دینے والا زیادہ قیمتی مال دینا چاہتا ہے اور عامل کم لینا چاہتا ہے،یہ برکت اسی اسلامی اصول کی تھی کہ ہر شخص حق طلبی کے بجائے فرض شناسی کی فکر میں تھا اور اس میں احتیاط وتقویٰ سے کام لینا چاہتا تھا۔

اور ظاہر ہے کہ دربارِ رسالت ﷺ سے اس قسم کی ہدایات کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ کسی فریق کے ظلم کو روا رکھا گیا اور دوسرے فریق کو محض صبر کی تلقین کی گئی،بلکہ دوطرفہ ہدایتوں کا حاصل یہ تھا کہ ہر فریق حق طلبی کی فکر چھوڑ کر فرض شناسی کی فکر میں لگے اور پورے معاشرہ کے اخلاق اور حوصلے بلند ہوں اور حق طلبی کے جھگڑوں کی بجائے فکریں یہ ہوں کہ ایک طرف سے حق رسانی میں احتیاط پر نظر ہو،دوسری طرف سے وصولیِ حق میں احتیاط پر نظر رہے۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فیصلے قاضیانہ اور حاکمانہ نہ تھے،بلکہ مربیانہ ہدایات تھیں اور جہاں کہیں ان ہدایات سے کام نہ چلا اور مقدمہ مقدمہ کی صورت میں دائر ہوا تو بال کی کھال نکالی جاتی اور جتنا جس کا حق ہوتا اس کو پہنچایا جاتا تھا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں حکام اور عوام کو اپنے اپنے فرائض بتلا کر

حکومت کو ایک خالص پالیسی کی ہدایت کر دی گئی کہ ہر فریق کو اپنے اپنے فرائض کی فکر میں لگانے کی تدبیریں کی جائیں تا کہ حق طلبی اور حق تلفی کے جھگڑے جس راہ سے پیدا ہوتے ہیں وہیں بند لگا دیا جائے اور جب تک ان اسلامی ہدایات پر عمل کیا گیا عدالتوں میں مقدمات کے واقعات انتہائی کم خال خال نظر آتے ہیں اور جوں جوں یہ اصول نظر انداز ہوتا گیا مقدمات کی کثرت ہوتی گئی،جھگڑے بڑھتے گئے،جو کسی اہلِ تجربہ پر مخفی نہیں۔

نظامِ اسلام میں معاشرہ کی اخلاقی تربیّت کا مقام

نظام اسلام کی عالمگیر خوبی اور بہبودی اور اس کے زیرِ سایہ پورے باشندگانِ ملک کے امن واطمینان کی روح یہی تھی کہ اس نے جیسے ایک طرف حکام اور عوام دونوں کو آئین وقانون کا پابند بنایا تھا تو دوسری طرف ہر قدم پر ان کے اخلاق کی تربیت کا انتظام تقویٰ و دیانت اور خدا ترسی کے اصول سے کیا جاتا تھا،فرض شناسی کے جذبات کو بڑھایا جاتا اور حق طلبی کے جذبات کو عفو ودرگذر کے فضائل سے دبایا جاتا تھا،قرآن کے اسلوبِ حکیم میں ہر جگہ اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ جہاں کوئی حکم اور قانون بیان کیا جاتا ہے تو آگے وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ، وغیرہ کے الفاظ سے اللہ اور حسابِ آخرت کا خوف دلا کر قانون کے پابند ہونے کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے،کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ محض قانون کسی قوم کی اصلاح اور جرائم سے اس کی حفاظت کا ضامن نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ تقویٰ،دیانت،اور خدا ترسی کے جذبات اس کو اپنی خلوتوں میں اس قانون کی خلاف ورزی سے نہ روکیں۔

آج دنیا میں جتنے جھگڑے فساد ہیں ان کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اربابِ انتظام نرے قانون کے پیچھے پڑ گئے،دیانت وامانت اور اخلاقی برتری کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔

پاکستان میں مہاجرین کی آباد کاری،غلہ کی فراہمی،ضروری اشیاء میں بلیک مارکیٹ،رشوت وغیرہ کی روک تھام میں ہماری حکومت روز نئے قانون بناتی ہے،عملے بدلتی ہے،کروڑوں روپیہ خرچ کرتی ہے،مگر نتیجہ صفر کے برابر نظر آتا ہے اور جب کبھی پھر

اس ناکامی پر نظر کی جاتی ہے تو پھر کوئی نئی اسکیم بنالی جاتی ہے، مرض کے اصلی سبب پر اس وقت بھی نظر نہیں جاتی۔

اور وہ صرف یہی ہے کہ نرا قانونِ حکومت کبھی ان مشکلات پر قابو نہیں پا سکتا، جب تک قوم کی اخلاقی اصلاح نہ ہو اور تجربہ شاہد ہے کہ اخلاقی اصلاح کے لئے مذہب اور فکرِ آخرت سے بڑھ کر کوئی چیز موثر نہیں ہوسکتی، یہی وہ عصائے موسیٰ ہے جو ظلم و جور، فسق و فجور کے جذبات کو بھسم کردینے والا ہے مگر افسوس ہے کہ ہمارے اربابِ اقتدار اسی بنیاد کو ڈھانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، اول تو زمانہ کی ہوا، فضا خود ہی دیانت وامانت کے خلاف ہے، کچھ مذہبی اداروں، کچھ علماء وصلحاء کی صحبت سے جو رہا سہا مذہبی اور اسلامی رنگ لوگوں میں تھا پاکستان بننے کے بعد وہ بھی ختم ہو رہا ہے، حکومت کے ذمہ دار بجائے اس کے کہ اس رنگ کی حفاظت بلکہ بڑھانے کی سعی کرتے اس کو مٹانے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں، پھر یہ شکایت ہے کہ عوام کسی قانون کو چلنے نہیں دیتے، ایک چالاک مہاجر جھوٹ فریب کرکے دس دس جگہ الاٹ کرالیتا ہے، دوسرے غریب و بے کس مہاجر مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں' پانی کے پائپ کا انتظام کیا جاتا ہے تو اس کی ٹونٹیاں نکال کر بیچ دی جاتی ہیں، اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ یہ پانی سارا ضائع ہوجائے گا اور سب لوگ اس سے محروم ہوجائیں گے۔

بلاشبہ جس طرح حکومت پر مہاجرین کی ذمہ داری عائد ہے، خود مہاجرین پر بھی تو دوسرے مہاجرین کی ہمدردی فرض ہے، لیکن یہ فرض کون بتلائے، تعلیم، نشرواشاعت، سرکاری عہدوں میں مذہب اور اہلِ مذہب سے بغاوت کی عملی تلقین کی جاتی ہے، فکرِ آخرت کو رجعت پسندی سمجھا جاتا ہے اور محض اسکیموں اور قانون کی دفعات پولیس اور پلٹن سے یہ امید رکھی جاتی ہے کہ وہ قوم کا مزاج بدل دے، اس کو خودفریبی کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اربابِ حل وعقد کی آنکھیں کھول دے کہ امریکہ انگلینڈ کی دریوزہ گری چھوڑ کر اپنے گھر کی دولت کو دیکھیں، اسلام کے اصولِ صحیحہ پر عمل کریں' خدا تعالیٰ پر اعتماد کریں، پھر دیکھیں کہ دنیا سے ان کا گیا ہوا اقتدار کس طرح واپس آتا ہے،

وَمَا ذٰلِکَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۔

یہ مختصر خاکہ ان دستوری مسائل کا جو قرآنِ کریم کی آیات سے نکلتے ہیں اور میں شروع میں کہہ چکا ہوں کہ نہ تمام ایسی آیات کا استیعاب ممکن تھا اور نہ اس بیان کا مقصد پورا دستور بیان کرنا ہے، بلکہ درسِ قرآن کے ذیل میں آئی ہوئی چند آیات کا بیان ہے۔

پورا اسلامی دستور آیاتِ قرآنی اور ارشاداتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تعاملِ خلفائے ارشدین ہی سے حاصل ہوسکتا ہے، جس کے بیان کا یہ موقع نہیں، تاہم اس بیان سے اتنا واضح ہوگیا کہ دستورِ مملکت کی اہم بنیادی دفعات خود قرآن میں بصراحت ووضاحت موجود ہیں، ان کو ملاؤں کے خیالات وقیاسات کہہ کر نہیں ٹالا جاسکتا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

اکابرِ ملّت کی آراء

دستورِ قرانی کے متعلق حضرت مولانا سیّد سلیمان صاحبؒ ندوی

صدر بورڈ تعلیمات اسلام، دستور ساز اسمبلی پاکستان کی رائے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دستورِ اسلامی اور قرآنِ پاک

اسلام اور دیگر مذاہب اور خصوصاً عیسائیت کے درمیان دین کی حقیقت کے باب میں ایک عظیم الشان فرق ہے، موجودہ انجیل نے یہ کہہ کر ''جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو'' دو بادشاہ مان لئے۔ ایک دنیا کا اور دوسرا آخرت کا ایک قصر وایوان میں رہتا ہے اور دوسرا کلیسا میں لیکن اسلام خدا کے سوا کسی قیصر کو نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ شہنشاہی صرف اسی ایک خدا کی ہے ''لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ'' (۲:۵۷) اور ''وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ'' (۴۳:۸۴) (آسمان اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور وہی آسمان میں خدا ہے اور وہی زمین میں خدا ہے) ''وَلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا'' (۱۸:۲۶) (اور اسکی حکومت میں کوئی دوسرا شریک نہیں)۔

اسلام نے دنیا کی باتوں کو صدق و دیانت اور حکمِ الٰہی کے موافق بجالانے ہی کا نام آخرت کا کام رکھا ہے، مسجد کا عبادت گزار اور میدان غزا کا سپاہی اور حاکمِ عادل سب دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں...... سلطنت وحکومت کے فرائض عدل وانصاف اور حسبِ حکمِ الٰہی انجام دینے کا بھی وہی ثواب ہے جو رات بھر عبادتِ الٰہی میں قیام و سجود کرنے والے کے لئے ہے۔

اسلام نے جہاں عبادت واخلاق ومعاملات کی تفصیلات بیان کی ہیں وہیں حکومت و سلطنت کے احکام وآداب بھی بیان کئے ہیں، جن میں سے اہم دفعات موروثی سلطنت کی نفی، انتخابِ رئیس، فضائل رئیس، مساوات، حقوق، بیت المال کا شخصی تصرت میں نہ ہونا، حکام کا عادل ومنصف ہونا اور بندگانِ الٰہی کا راعی ونگران وخادم ہونا وغیرہ اوصاف ہیں۔

یورپ نے اپنی نشاۃ ثانیہ میں اسلام سے جہاں علوم وحکمت کے مسائل سیکھے، آداب سلطنت کے مسائل بھی اختیار کئے اور جمہوریت اور ڈیموکریسی کے نام سے ذاتی تجربوں اور قومی خصائص کے اضافوں کے ساتھ اپنی اپنی حکومت کے دستور مقرر کئے اور ان کے مطابق سلطنت کے اصولِ نظم ونسق ترتیب دیئے۔

ادھر اسلامی حکومتوں نے بجائے اس کے کہ اپنے مذہبی وقومی خزانہ پر نظر رکھتے جس طرح دوسری چیزوں میں یورپ کی نقالی ترقی کے لئے ضروری قرار دی، اسی طرح انہوں نے یورپ کی سلطنتوں کے دستوروں کی نقالی بھی ضروری قرار دی اور اپنے لئے ایک ایک دستور بنا لیا اور سمجھا کہ سرمایہ صرف یورپ کے پاس ہے۔

قیام پاکستان نے جہاں مسلمانوں کی دوسری چیزوں میں رہنمائی کی اس کی طرف بھی رہنمائی کی کہ اسلامی دستور مرتب کیا جائے اور محققینِ علوم اسلامیہ کے ذہن ادھر متوجہ ہوئے کہ اسلامی دستور کی ترتیب قرآن وسنت سے دی جائے اور اسی غرض کے لیے اس نے اپنی دستور ساز مجلس میں شعبہ تعلیماتِ اسلامی کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا تاکہ اسلامی دستور کے مسائل میں اس سے رہنمائی چاہی جائے، اس رسالہ کے مؤلف حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب شروع سے اس شعبہ کے رکن ہیں اور اس سلسلہ میں تمام دستوری مسائل میں غور وفکر کرتے رہے ہیں، انھوں نے اس زمانہ میں جب کہ بعض کم فہم اہلِ اقتدار نے قرآن پاک سے کسی اسلامی دستور کے انخراج پر معارضہ کیا تو مفتی صاحب موصوف نے اہل ذوق کے اصرار سے اپنے درسِ قرآن کے سلسلہ میں ان مسائل پر قرآن پاک کی روشنی میں ایک دو تقریریں فرمائیں جن کو سامعین نے پسند کیا اور ان کے اصرار سے وہ قلمبند ہوکر رسالہ کی شکل میں شائع ہو رہی ہیں، مؤلف نے ان تقریروں میں گو استقصاء کا قصد نہیں کیا ورنہ اور بہت سی آیتیں اور

رول کے استنباطات کا اضافہ کیا جا سکتا تھا، بہر حال جو کچھ ہو گیا ہے وہ کافی ہے، امید ہے کہ اس رسالہ کو عام مسلمان اور خصوصاً مجلس دستور ساز کے ارکان اور وزراءِ عظام پڑھ کر فائدہ حاصل کریں گے، اور اسی لئے تصحیح و تکمیل فائدہ کی غرض سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا جائے۔

والسلام

سیّد سلیمان ندوی

صدرِ مجلس تعلیماتِ اسلام، اسمبلی پاکستان

یکم محرم ۱۳۷۳ھ

رائے گرامی از: حضرت مولانا محمد ادریس صاحبؒ

شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ الذی لا حاکم سواہ- والصلاۃ والسلام
علی رسولہ سیدنا و مولانا محمد مصطفاہ-

اما بعد- بندۂ ناچیز نے اسلامی دستور کی دفعات کے متعلق دستور قرآن از افادات حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت فیوضہم سابق مفتی دارالعلوم دیو بند کو دیکھا موجب صد نور و سرور ہوا، یہ رسالہ اپنی نوعیت میں پہلا رسالہ ہے جس میں اسلامی دستور کی چند اہم دفعات کو نہایت عمدگی سے قرآنِ کریم کی آیات سے مستنبط فرمایا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ جناب مؤلف کو تمام مسلمانوں کی طرف سے جزاءِ خیر عطا فرمائے اور اس مبارک رسالہ کو دستورِ اسلامی کے افتتاح اور آغاز کا ذریعہ بنائے اور اس پاک دستور کو گزشتہ ناپاک دستور کیلئے آبِ طہور بنائے۔ آمین یارب العالمین۔

العبد محمد ادریس کان اللہ لہ

۲۵/ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ

از رائے گرامی: حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ

خلیفۂ خاص حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ
مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

احقر نے باوجود شدید علالت کے دستورِ قرآنی کے تیس صفحات بڑے شوق و دلچسپی سے پڑھے۔ مفتی صاحب نے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا کہ دستورِ مملکت کے اہم دفعات قرآنِ کریم کی آیات سے ثابت فرمائی، الفاظ کی صولت و ہیبت خاص مصنف ہی کا حصہ ہے جو ان کی تمام تصانیف میں مشاہد ہے۔ میں مولانا سید محمد ادریس صاحب کی تحریر سے حرف بحرف متفق ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ مفتی صاحب کی دوسری تصانیف کی طرح یہ رسالہ بھی مقبول ہو اور مفید نتائج کا حامل ہو۔

محمد حسن
مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور